اردو شاعری

BAUL-302

(دوسرا پرچہ) برائے بی۔اے سال سوم

Block- 1 to 3 (بلاک ۱ تا ۳)

Unit- 1 to 10 (اکائی ۱ تا ۱۰)

SCHOOL OF LANGUAGES
UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY, HALDWANI
(NAINITAL) -263139

اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

سرپرست اعلیٰ:

پروفیسر سبھاش دھولیا' وائس چانسلر' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی

کمیٹی بورڈ آف اسٹڈیز:

پروفیسر ایچ۔ پی شکلا (ڈائرکٹر' اسکول آف لینگویجز UOU)
پروفیسر سید محمد ہاشم' شعبہ اردو' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ۔
پروفیسر سید محمد نعمان' این۔سی۔ای۔آر۔ٹی' دہلی۔
ڈاکٹر اختر علی' اکیڈمک ایسوسی ایٹ' شعبہ اردو' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی' ہلدوانی۔

رجسٹرار:

پروفیسر گرجا پانڈے' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی' ہلدوانی۔

کورس کوآرڈینیٹر وایڈیٹر:

ڈاکٹر اختر علی

اکیڈمک ایسوسی ایٹ' شعبہ اردو' اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی' ہلدوانی (نینی تال)

c جملہ حقوق محفوظ ہیں

اشاعت: جولائی 2013

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ کسی بھی شکل میں یونیورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب اتراکھنڈ اوپن یونیورسٹی' ہلدوانی کے درس نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات یا کسی بھی وضاحت کے لیے یونیورسٹی حکام یا کورس کوآرڈینیٹر سے یونیورسٹی کے حسب ذیل پتے پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

Course Coordinator (urdu)

Uttarakhand Open University,Haldwani-263139(Nainital)

Phone: 05946-261122, 261123 Tool free No. 1800 180 4025

Fax: 05946-264232, E-mail: info@ uou.ac.in,http://uou.ac.in

پیش لفظ

اتراکھنڈاوپن یونیورسٹی کا قیام اتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت 31 اکتوبر 2005 کو عمل میں آیا جس کا مقصد آبادی کے بڑے حصے کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل اور فاصلاتی طریقہ تعلیم کے ذریعے ان لوگوں تک تعلیم کو پہنچانا ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب ازخود کالجوں اور یونیورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونیورسٹی نے اپنے آغاز کے ساتھ ہی جن تعلیمی پروگراموں کی شروعات کی ہے ان میں سے ایک بیچلر آف آرٹ بھی شامل ہے۔ ''اردو ادب'' اس پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ یہ کتاب بی۔اے سال سوم (دوسرا پرچہ) کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ تین بلاکوں اور دس اکائیوں پر مشتمل ہے۔ یہ اکائیاں دراصل الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی طریقہ تعلیم کی کتابوں کو خود تدریسی مواد [Self Instructional Material(SIM)] کہا جاتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ طالب علم کو اس مواد کو خود ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اسے پڑھانے کے لیے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں رہے گا۔ آپ اس مواد کو خود ہی پڑھیں گے اور خود ہی سمجھیں گے۔ اس صورتحال کے تحت اسباق کو اس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں موجود ہونے کا احساس ہو سکے اور کلاس میں نہ ہونے کی کمی بہت حد تک دور ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اکائی کا آغاز اغراض و مقاصد سے کیا گیا ہے تا کہ آپ کو اندازہ ہو سکے کہ اس اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔ اس کے بعد تمہید دی گئی ہے جس میں سبق کو مربوط و مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان میں ''اپنے مطالعے کی جانچ کے سوالات'' بھی دیے گئے ہیں تا کہ آپ نے جو کچھ بھی پڑھا ہے اسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے' اس کا اندازہ لگا سکیں۔ ان سوالات کے جوابات آخر میں دیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود ہی جواب دیں اور جب جواب مکمل ہو جائے تب آخر میں دیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملا لیں۔ اس سے آپ کو اپنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگا اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہوگی۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اس کے نمونے بھی دیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ اکائیوں کے آخری حصے میں بعض کتابوں کے نام دیے گئے ہیں۔ آپ ان کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکتے ہیں۔

ہم آپ کی کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ نیک تمنائیں پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

فہرست

بلاک نمبر ۱۔ غزل

اکائی ۱۔ میر تقی میرؔ	ڈاکٹر محمد صابر علی
اکائی ۲۔ خواجہ میر دردؔ	ڈاکٹر محمد صابر علی
اکائی ۳۔ سراجؔ اورنگ آبادی	ڈاکٹر اختر علی
اکائی ۴۔ ولیؔ اورنگ آبادی	ڈاکٹر پرویز احمد

بلاک نمبر ۲۔ غزل

اکائی ۵۔ جگرؔ مرادآبادی	ڈاکٹر ریشمہ پروین
اکائی ۶۔ مجروحؔ سلطانپوری	ڈاکٹر سرورالہدیٰ
اکائی ۷۔ عزیزؔ لکھنوی	پروفیسر محمود الحسن

بلاک نمبر ۳۔ نظم

اکائی ۸۔ علامہ اقبال: سید کی لوح تربت	محترمہ بی بی رضا خاتون
اکائی ۹۔ الطاف حسین حالی: بحیثیت نظم نگار	ڈاکٹر نکہت جہاں
اکائی ۱۰۔ نظیرؔ اکبرآبادی: ہنس نامہ	ڈاکٹر شریف احمد قریشی

بلاک نمبر-1

غزل

اکائی ۱۔میر تقی میرؔ

اکائی ۲۔خواجہ میر دردؔ

اکائی ۳۔سراجؔ اورنگ آبادی

اکائی ۴۔ولیؔ اورنگ آبادی

اس بلاک کی پہلی اکائی ناخدائے سخن کہے جانے والے عظیم غزل گو شاعر میر تقی میرؔ سے متعلق ہے۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ میر تقی میرؔ کی حیات اور ان کی شاعری کے بارے میں تفصیلات سے جان سکیں گے۔ان کی شاعری کی وہ تمام جہتیں دیکھیں گے جس کے باعث میر کو انفرادیت اور شہرت حاصل ہوئی اور وہ تغزل کے بادشاہ کہلائے۔اس میں میرؔ کی دو غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں جن کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے تاکہ آپ میرؔ کی شاعری کے اوصاف بخوبی سمجھ سکیں۔دوسری اکائی اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر دردؔ کی حیات،ان کی شاعرانہ عظمت پر مبنی ہے۔ان کی مقبولیت کی وجہ ان کا عارفانہ کلام اور تصوف و معرفت سے لبریز شعری تخلیقات ہیں۔ان کی دو غزلیں مع تشریح کے شامل نصاب ہیں۔تیسری اکائی سراجؔ اورنگ آبادی اور چوتھی اکائی ولیؔ اورنگ آبادی سے متعلق ہے۔سراجؔ کی شاعری دکنی لب و لہجہ کی شاعری ہے۔ولیؔ سے قبل اردو شاعری کی روایت دکن میں ملتی ہے جبکہ شمالی ہند میں فارسی شاعری کا چرچا تھا۔ولیؔ نے اردو غزل کو شمالی ہند میں رواج دے کر نہ صرف اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا بلکہ اردو شاعری میں شمال اور جنوب کو ملانے کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ان دونوں دکنی شاعر کی بھی دو دو غزلیں مع تشریح کے شامل کی گئی ہیں۔ان اکائیوں کا مطالعہ غزل گوئی کے میدان میں آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ کرے گا۔

اکائی 1: میر تقی میر

ساخت

1.1 اغراض ومقاصد

1.2 تمہید

1.3 میر تقی میر کی حیات

1.4 میر تقی میر کی شاعرانہ خصوصیات

1.5 میر کی غزل (1)

1.5.1 مجموعی تاثر

1.5.2 اشعار کی تشریح

1.6 میر کی غزل (2)

1.6.1 مجموعی تاثر

1.6.2 اشعار کی تشریح

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے مطالعے سے آپ میر تقی میر کی حیات اوران کی شاعری کے متعلق پوری تفصیلات جانیں گے۔ ان کی شاعری کی وجوہات اوران کی زندگی کی کشمکش کو بھی آپ بخوبی محسوس کریں گے۔ ساتھ ہی آپ میر کی شاعرانہ عظمت کی پوری تصویر آپ کے سامنے نظر آئے گی۔ اس روشنی میں آپ محسوس کرسکیں گے کہ میر تقی میر کو کیوں خدائے

سخن اور اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس اکائی میں آپ ان کی شاعری کی وہ تمام جہتیں دیکھیں گے جس کے باعث میر کو انفرادیت اور شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں میر کی دو غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں اور ان غزلوں کی سیاق وسباق کے ساتھ تشریح بھی پیش کی گئی ہے تا کہ آپ میر کی شاعری کے اوصاف کو بخوبی سمجھ سکیں۔

1.2 تمہید

ہر زبان کی شاعری میں بڑی بڑی ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ شاعری کے ذریعے سماج اور معاشرے میں بہت سی تبدیلیاں لائی گئی ہیں۔ ادب سماج اور زندگی کا آئینہ دار ہوتا ہے اس لیے ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تا کہ زندگی کی حقیقتوں کو سمجھا جا سکے۔ اور اس کی روشنی میں بہتر زندگی گزارنے کی کوشش کی جا سکے۔ اردو شاعری میں بھی بہت سے شعراء وادباء نے اردو زبان وادب کے ستونوں کو مضبوط کرنے میں نہایت اہم رول ادا کیے ہیں۔ ان میں نثر ونظم دونوں شامل ہے۔ خصوصاً شاعری کے حوالے سے بات کی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ شاعری میں زود اثر عناصر ہوتے ہیں جس کا سیدھا اور بہت جلد اثر قاری پر پڑتا ہے اور وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ اردو شاعری میں بھی بہت سے شعراء کی خدمات کا ذکر آتا ہے جن میں ولی دکنی، قلی قطب شاہ، درد، میر، فانی، حسرت اور غالب واقبال کے نام نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ ہم یہاں انھیں شعراء میں سے ایک عظیم شاعر میر تقی میر کی شاعری اور ان کی زندگی کے بارے میں مطالعہ کریں گے۔ آیئے دیکھیں کہ میر کی شاعری اور زندگ کی کیا خصوصیات رہی ہیں جن کی وجہ سے میر کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا جاتا ہے۔

1.3 میر تقی میر کی حیات

میر کا نام محمد تقی اور میر تخلص تھا۔ وہ آگرہ میں 1723ء میں پیدا ہوئے۔ میر کے دادا فوج میں ملازم تھے۔ ان کے والد محمد علی ایک صوفی بزرگ تھے۔ میر بچپن سے صوفیوں اور عالموں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ ان کی باتیں سنتے اور سادہ زندگی بسر کرتے۔ ابھی میر صرف دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ میر نے اپنی کتاب ''تذکرۂ میر'' فارسی زبان میں لکھی ہے جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے، اس کتاب میں انہوں نے اپنے والد کے اوصاف کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے۔ والد کے انتقال کے بعد انھوں نے سوتیلے بھائیوں کے رویے سے پریشان ہو کر وطن اکبر آباد (آگرہ) چھوڑ دیا۔ میر 17 سال کی عمر میں دلی چلے آئے۔ دلی

میں میر نے سراج الدین علی خان آرزو کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔ جو میر کے رشتہ دار تھے۔ میر نے ریختہ گوئی کا آغاز آرزو کے کہنے پر ہی کیا تھا۔ میر تقی میر کی زندگی کا زیادہ تر وقت دلی میں ہی گزرا۔ دلی میں انھیں مختلف امرا و رؤسا کی سرپرستی حاصل رہی۔ دلی کی تباہی کی وجہ سے میر دلی سے باہر نکل گئے اور اکبر آباد (آگرہ) ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ اس وقت تک میر کو کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے لیے تین سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ لیکن نواب کے ساتھ ان کا نباہ نہ ہو سکا اور لکھنؤ میں ہی ان کا انتقال 1810ء میں ہوا۔

میر کی زندگی میں والد کے انتقال کے بعد ہی پریشانیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب ان کے والد کا انتقال ہوا تو وہ بے سہارا ہو گئے۔ کوئی پرسانِ حال نہ تھا۔ انھوں نے خود اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جو محمد تقی کے پیروں کی دھول کو سرمے کی طرح آنکھوں میں لگاتے تھے وہ ان کے سایے سے بھاگنے لگے۔ میر کا ہی یہ شعر ان حالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اپنا ہی ہاتھ سر پر رہا اپنے یاں سدا
مشفق کوئی نہیں ہے کوئی مہرباں نہیں

یا میر کا یہ شعر جس میں انھوں نے اس دور کی منظر کشی کی ہے:

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یا کبھو سرو گل کے سائے تھے

میرؔ کی ساری زندگی حسرتوں کی ایک طویل داستان ہے۔ ان حسرتوں سے خود میر کو تکلیفوں کے سوا کچھ نہ ملا۔ لیکن ان تکالیف کی وجہ سے میر کی اردو شاعری کو ایسا انمول خزانہ ہاتھ آیا جو رہتی دنیا تک یادگار رہے گا۔ میر اپنی شاعری اور تصانیف کی وجہ سے پوری دنیائے شاعری میں مقبول تھے۔

میر تقی میر نے جب لکھنؤ کے سفر کا عہد کیا تو اُن کے ساتھ کیا کیا مسائل پیش آئے' ان تمام کا ذکر اپنی تصنیف میں کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن بے سامانی سے مجبور تھا۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کے خیال سے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک نے چاہا کہ میرؔ میرے پاس آ جائے تو اچھا ہو۔ چنانچہ میری طلبی

کے لیے نواب سالار جنگ پسر اسحاق موتمن الدولہ نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے۔ ان قدیم تعلقات کی وجہ سے جو میرے خالو سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ زادِ راہ عنایت فرمائیں تو البتہ میر صاحب یہاں آ سکتے ہیں۔ نواب صاحب نے حکم دیا اور انھوں نے سرکار سے زادِ راہ لے کر مجھے خط لکھا کہ نواب والا جناب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جس طرح ہو سکے آپ یہاں آ جایئے میں پہلے ہی سے دل برداشتہ بیٹھا تھا خط کے آتے ہی لکھنؤ روانہ ہو گیا۔ چونکہ خدا کی یہی مرضی تھی۔ میں بے یار و مددگار بغیر قافلہ اور رہبر کے فرخ آباد کے رستے سے گزرا وہاں کے رئیس مظفر جنگ تھے انھوں نے ہر چند چاہا کہ کچھ روز وہاں ٹھہر جاؤں مگر میرے دل نے قبول نہیں کیا۔ دو ایک روز بعد روانہ ہو کر منزل مقصود پہنچ گیا۔''

(بحوالہ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ: صفحہ 98)

میر صاحب نے لکھنؤ میں زندگی آرام سے گزاری جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ نواب آصف الدولہ جب شکار کے لیے بہرائچ گئے تو میر صاحب بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس کی یادگار میں میر نے ''شکار نامہ'' موزوں کیا۔ دوسری دفعہ نواب آصف الدولہ جب کوہِ شمال کے دامن تک گئے تو میر نے دوسرا ''شکار نامہ'' تیار کیا اور اسے ان کے حضور پیش کیا۔ اس شکار نامہ کی دو غزلوں کی نواب آصف الدولہ نے بطور مخمس تضمین کی۔

میر تقی میر اس دور کے متعلق اور اپنی طبیعت کی بابت پوری صداقت سے تحریر فرماتے ہیں:

''اس زمانے میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے۔ یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے۔ بڑھاپا آ پہنچا ہے اور عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھائی۔ ضعف بصری کی وجہ سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں۔ آخر دل کڑا کر کے ایک ایک کو جڑ سے اکھڑا دیا۔ غرض کہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے۔ بس آرزو اتنی ہے کہ خاتمہ بخیر ہو۔''

(ماخوذ از ذکر میر مرتبہ: مولوی عبدالحق۔ بحوالہ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، صفحہ 98)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات بخوبی معلوم ہوجاتی ہے کہ میر کی زندگی مصائب و آزمائش سے عبارت تھی۔ عمر کے آخری دنوں میں ان کی طبیعت خراب رہتی تھی۔ اور آنکھ کی بصارت پر بھی اثر پڑ گیا تھا۔ ساتھ ہی ان کے دانتوں میں درد رہنے لگا تھا اور زندگی سے مایوس ہو چلے تھے۔ یہ تو وہ حالات تھے جو ان کی زندگی کے آخری ایام میں پیش آئے مگر ان کی پوری زندگی مختلف آزمائشوں اور معاشی مشکلات میں گزری کبھی بھی فارغ البالی نصیب نہ ہوئی۔

اگر میرؔ کی طبیعت اور ان کے مزاج کے متعلق بات کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابتدا ہی سے خوددار واقع ہوئے تھے اور حساس طبیعت کے مالک تھے۔ وہ بڑے بڑے مشائخ اور امرا سے بھی ملاقات اور میل جول کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ ایک آزاد طبیعت کے مالک تھے۔ حالانکہ ان کی زندگی میں افلاس اور تنگدستی نے بار بار پیچھا کیا لیکن میر کبھی بھی ان سے اس حد تک متاثر نہ ہوئے کہ ان کی اعلیٰ ظرفی پر حرف آسکے۔ وہ زود رنج اور تنک مزاج بھی واقع ہوئے تھے جس کی وجہ سے بعض مواقع پر انھیں بہت سے معترضین کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اپنے ان غموں کی تشریح اس انداز میں کرتے ہیں جن سے وہ نبرد آزما ہوتے رہے:

حالت تو یہ ہے مجھ کو غموں سے نہیں فراغ
دل سوزش درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے سارا جگر ہے داغ
ہے نام مجلسوں میں میرا میرؔ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار
ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا
نازک مزاج آپ قیامت ہیں میر جی
جون شیشہ میرے منہ نہ لگو میں نشے میں ہوں

غرض میر تقی میر کی حیات ابتدا سے انتہا تک عبرت آموز اور تاریخی اعتبار سے حوصلہ خیز ہے۔ کیوں کہ جب کم عمری میں سایہ پدری ان کے سر سے اٹھ گیا تو ان کے سوتیلے بھائیوں نے انھیں پریشان کرنا شروع کر دیا اور پھر وہ تلاش معاش میں مختلف شہروں کا چکر لگاتے رہے اور ان سفروں میں انھیں مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ تنگدستی سے پالا پڑا۔ معاصرین کی تنقید کے نشانے بنے۔ اپنوں نے ستایا اور دوسروں نے بھی انھیں تکلیف پہنچائی

۔عشق میں ناکامی ہوئی۔مزاج کی انانیت اور خودداری کی وجہ سے بادشاہان وقت کے عتاب کا شکار ہوئے اور امراء وقت سے انھیں خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکا۔لکھنؤ میں عمر کے آخری ایام میں مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوئے اور آخر وقت تک ان کی خودداری اعلیٰ ظرفی اور خوداعتمادی باقی رہی۔یہی میر کی ثبات قدمی اور استحکام طبعی تھی جس کی وجہ سے وہ بڑے بڑوں سے بھی مرعوب نہ ہو سکے اور امیران وقت کو بھی خاطر میں نہ لا سکے۔اگر یہ تمام غم ان کی زندگی کا حصہ نہ ہوتے تو شاید ان کی شاعری میں اتنی دلکشی' معنویت' اثر' دلفریبی اور مقصدیت نہ ہوتی اور نہ ہی ان کے عشق کے درد کا احساس دوسروں کو ہو پاتا۔یہی تمام وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ان کی شاعری میں زندگی کی رمق اور حیاتِ انسانی کی مکمل تصویر نظر آتی ہے اور ان ہی موضوعات کی خوبصورت منظر کشی' اظہار بیان' اور عام فہم انداز نے انھیں اردو کا سب سے بڑے شاعر ہونے کا اعزاز عطا کیا۔آج میر کو عظیم ترین شاعر مانا جاتا ہے اور انھیں ''خدائے سخن'' کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

1. میر کی پیدائش کب اور کہاں ہوئی؟
2. تذکرۂ میر کس زبان میں لکھی گئی ہے؟
3. میر کا زیادہ تر وقت کہاں گزرا
4. میر کے والد کے انتقال کے بعد انہیں کن لوگوں نے پریشان کیا؟

1.4 میرؔ کی شاعرانہ خصوصیات

میرؔ کی زندگی مصیبت اور درد وغم سے عبارت تھی۔انھوں نے اپنی زندگی میں مختلف اتار چڑھاؤ اور تلخ و شیریں تجربات کیے۔ان تمام تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری ہے۔وہ شاعری میں زندگی کی عکاسی کے قائل ہیں اور ان کی شاعری اردو ادب کے سرمائے میں ایک روشن باب کا درجہ رکھتی ہے۔میر تقی میر کو آج تک اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔میر کی شاعری کی اہم خصوصیت یہ شمار کی جاتی ہے کہ ان کے اشعار سیدھے دل میں اتر جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ میر کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی ہے۔ان کی شاعری بول چال کی زبان میں ایسی پرکشش معلوم ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے اسے بار بار پڑھا جائے۔ان کے اشعار سیدھے تیر کی طرح دل میں اترتے چلے جاتے ہیں۔میر کی زندگی اور شاعری کے متعلق پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

''میر نے اپنی زندگی تکلیف اور بدحالی میں گزاری تھی اس لیے انھیں اجڑی ہوئی

دلی کی علامت کہنا غلط نہ ہوگا۔صوفی منش باپ نے انھیں سکھایا تھا کہ دنیا میں محبت کے علاوہ کچھ نہیں، یہی زندگی ہے اور اس کے لوازم قناعت، بردباری، خودداری، اور غم کو شی ہیں۔ یہ باتیں ان کے اندر رچ بس گئی تھیں۔اور انھیں نے ان کی شاعری میں زندگی کی آگ پیدا کردی تھی۔ جب مصائب نے انھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور بدحالی آخری حد کو چھونے لگی تو میر کی شخصیت میں ایک حیرت انگیز قسم کا بانکپن اور حسن پیدا ہوگیا۔انھوں نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو انسانی توہین سے تعبیر کیا اور خدا سے بھی ناز سے پیش آئے۔اس ذہن کے ساتھ نگاہِ محبت کا زخم بھی لگا جس نے شاعری کو آتش نوائی میں تبدیل کردیا اور آپ بیتی بنی نوع انسان کے دکھ درد کی ترجمانی کرنے لگی۔'' (اردو ادب کی تنقیدی تاریخ صفحہ 70)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرؔ ایک قناعت پسند اور متحمل مزاج شاعر تھے۔انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو جھیلا اور اسی آگ میں جلتے ہوئے اپنی شاعری کو بھی دو آتشہ بنایا۔انھوں نے کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔حالانکہ تنگ حالی اور غیر آسودگی نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری آپ بیتی نہیں جگ بیتی بن گئی۔اگر میر کی آپ بیتی کو جگ بیتی میں بدلتے دیکھنا ہے تو درج ذیل اشعار سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔جسے میر نے کافی تجربے کے بعد صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔آپ یہ اشعار دیکھیں تو اندازہ ہوجائے گا کہ میرؔ اردو دنیا کے سب سے بڑے شاعر کیوں تسلیم کیے جاتے ہیں۔

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہوسکے — پچھتاؤ گے سنو ہو، یہ بستی اجاڑ کے
ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا — آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے — یہ نمایش سراب کی سی ہے
نازکی اس کے لب کی کیا کہیے — پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میر ان نیز باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے
قامت خمیدہ، رنگ شکستہ، بدن نزار — تیرا تو میر غم میں عجب حال ہوگیا

میر کی سلاست اور سہل پسندی کا ہر شخص قائل ہے کیونکہ میر نے شاعری کو زبان کے لحاظ سے بوجھل نہیں بنایا ہے۔اس کی سیدھی سادی بول چال کی زبان میں اتنا مزہ اور اتنی مٹھاس اور دلی جذبات کی اتنی نازک مصوری اور اتنا

جوش تخلیق شعر کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لگا سکتا ہے جو شعر کی باریکیوں اور شعری حسن سے پوری طرح واقفیت رکھتا ہو۔ یہ اشعار دیکھیں اور میر کی عظمت کا اندازہ لگائیں۔

فقیرانہ آئے صدا کر چلے — میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو تم بن نہ جینے کی کہتے تھے ہم — سو اس عہد کو اب وفا کر چلے
نہ مل میر' اب کے امیروں سے تو — ہوئے ہیں فقیران کی دولت سے ہم
ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکرِ پریشاں کہاں کہاں میری
کچھ نہ دیکھا پھر بجز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب — شمع تک ہم نے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

میرؔ نے ایک ایسے وقت میں اپنی تخلیقات پیش کیں جب ان کی زندگی کی ساری خوشیاں' رعنائیاں اور حسین لمحات مکمل طور پر مفقود ہو چکے تھے۔ اگر ان کے سامنے امید کی کوئی کرن دکھائی دیتی تو تھوڑی دیر بعد وہ سراب ثابت ہوتی اور کم و بیش یہی حالت ان کے سامنے باہری دنیا کی تھی جہاں مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی اور مغلوں کی حیثیت ایک عام آدمی کی سی ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسے حالات میں میر نے شاعری کی۔ ظاہری بات ہے شاعر جن حالات سے دوچار ہوتا ہے اس کا عکس اس کے دل پر بہت گہرا پڑتا ہے۔ چنانچہ میر کی شاعری بھی ان ہی حالات و حادثات کی عکاسی کرتی ہے جو ان کی زندگی میں پیش آئے اور جن سے ان کا واسطہ رہا۔ کہیں کہیں تو اس وقت کے واقعات کی طرف صاف اشارے بھی ان کی شاعری میں ملتے ہیں۔ مگر زیادہ تر اس ماحول کی عکاسی کی گئی ہے جو سماجی انحطاط کے نتیجے میں پیدا ہو رہا تھا۔

میرؔ کی شاعری کی شہرت ان کی زندگی ہی میں چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ میر نے اپنی شاعری کی بنیاد زندگی کے حقائق پر رکھی اور ان موضوعات کو اپنے لیے انتخاب کیا جس کا براہ راست تعلق انسان کی زندگی سے ہوتا ہے۔ میر نے زندگی کے انھیں حقائق کو پیش کر کے اپنی شاعری میں مقصدیت کو جگہ دی اور شعر کو ایک نیا مزاج و آہنگ بخشا۔ انسانی جذبات کی جس خوبصورت انداز میں منظر کشی ہمیں میر کی شاعری میں ملتی ہے شاید ہی کسی دوسرے شعرا کے یہاں یہ ترجمانی پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ جیسا قد آور شاعر بھی میر کی عظمت کا اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکا:

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالبؔ کے علاوہ ذوقؔ نے بھی میر کی شعری خصوصیات اور میر کی شاعری کے محاسن کا اعتراف کیا ہے اور اپنے

انداز میں بے باکانہ طور پر غزل میں میر کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

میر تقی میر نے اپنے دل میں پیدا ہونے والے ان فطری جذبات و احساسات کو اپنے شعری قالب میں ڈھالا ہے جو عوام و خواص سب کی فکری اور محسوساتی بساط ہوتی ہے۔ میر کی شاعری میں عبرت آمیز کلمات اور سبق آموز نصائح بھی ملتے ہیں جو زندگی کی حقیقتوں سے بالکل قریب ہوتے ہیں۔

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
سامان لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

میر تقی میر دراصل جذبات کے شاعر ہیں۔ کوئی خیال ان کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً اس خیال کو شعر کے قالب میں نہیں ڈھالتے بلکہ یہ خیال ان کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ جذبہ اور خیال جب احساس کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو وہی ان کے تاثیر سے لبریز شعر کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ مثلاً موت کا فلسفہ جسے بہت سے شعرا نے مختلف انداز سے پیش کیا ہے لیکن جب میرؔ موت کی حقیقت پیش کرنا چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں:

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا میر کا یہ شعر جس میں انھوں نے اپنی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے زندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

پروفیسر نورالحسن نقوی نے میر کی شاعری کو عام فہم انداز میں بات کہنے یا گفتگو کرنے سے تشبیہ دی ہے۔ بول چال کی زبان میں جو شاعری کی جاتی ہے وہی شاعری تادیر اثر قائم رکھتی ہے اور یہ کلیہ بڑے بڑے ناقدین کا ہے۔

''میر شعر نہیں کہتے، باتیں کرتے ہیں۔ وہ باتیں جو سننے والے کو ایسی لگیں جیسے
پہلے سے اس کے دل میں موجود تھیں۔ انداز ایسا جیسے بے تکلف دوست اپنے دوست

سے راز و نیاز میں محو ہو۔ لہجہ سرگوشی کا' زبان عام بول چال کی۔''

(اردو شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ صفحہ 30)

اسی نکتے کو مختلف ناقدین نے مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور میر کی عظمت کے متعلق ان کی شاعری کے اوصاف گنوائے ہیں۔ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

''میر صاحب غزل گوئی میں مسلم الثبوت استاد مانے گئے ہیں۔ ان کے اشعار صاف' سادہ فصیح اور تیر و نشتر کا کام دینے والے درد و اثر سے مملو ہوتے ہیں۔ ان میں دلکشی اور زور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ اظہار جذبات' چستی بندش اور ترنم میں اپنی آپ نظیر ہیں۔ ان کے اکثر اشعار میں وہ ایک خاص کیفیت ہے جو سحر یا طلسم سے تعبیر کی جاسکتی ہے اور جو تمام زبانوں کی حقیقی اور سچی شاعری کا طغرائے امتیاز ہے۔ زبان صاف و شستہ' کلام صاف' بیان ایسا پاکیزہ اور دل آویز کہ جیسے باتیں کرتے ہیں۔ وہ اردو کے شیخ سعدی ہیں۔ ان کا کلام اکسیر شاعری ہے علی الخصوص چھوٹی بحروں کے تو وہ بادشاہ ہیں اور ہمارے نزدیک تو بڑی بحروں میں بھی وہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں جو حزن و ملال' حسرت و مایوسی سے مملو ہے وہی ان کی شاعری کی جان ہے۔ یہی ناامیدی اور یاس ان کی غزلوں کو زوردار اور مؤثر بناتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو۔ صفحہ 107)

میر کی شاعری عام بول چال کی زبان میں ضرور ہے مگر اس میں ایسا درد اور کرب پوشیدہ ہے جو حقیقت پر مبنی ہے میر کی زندگی ناکامیوں اور نامرادیوں سے عبارت ہے اور یہی ناکامی اور حرماں نصیبی ان کی شاعری میں پیوست ہو کر غم زمانہ بن جاتی ہے اور جب ان کی شاعری غم زمانہ بن کر ہمارے سامنے آتی ہے تو ہمارے ضمیر کی آواز محسوس ہوتی ہے' چونکہ میر بچپن ہی سے بے یار و مددگار اور بے سہارا ہو گئے تھے۔ ایسا شخص جب بھی محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کی انتہا نہیں ہوتی۔ اس انسان کی محبت کی ابتدا' انتہا کے نقطہ سے شروع ہوتی ہے اور اسی لیے اکثر ناکام ہوتی ہے۔ میر کی عشقیہ شاعری میں اس ناکامی و محرومی کا احساس موجود ہے۔ لیکن جب اس تاریخی ماحول کی چھاپ پڑ جاتی ہے تو اس سے زندگی کے عناصر چمک اٹھتے ہیں۔ میر جب اپنی خون فشانی سے دامن پر گل کاریاں کرتے ہیں تو ان کا آرٹ بلند ترین مقام پر پہنچ جاتا ہے اور کائنات خود اس سے سرگوشیاں کرنے لگتی ہے۔

میر کی شاعری دردانگیز ضرور ہے لیکن زہرناک اور مردم بیزار نہیں ہے۔ ان کو انسان کی عظمت پر پورا بھروسہ ہے اور وہ اسے آسان چیز نہیں تصور کرتے۔ یہ عرفان وادراک انھیں تصوف کے مختلف امید افزا پہلوؤں سے حاصل ہوا ہے۔ میر ناکام ہوتے ہیں لیکن ہمت نہیں ہارتے اور یہی ان کی بزرگی ہے۔ ان کے یہاں مصیبت میں استقامت ہے اور محرومی میں غیرت وحمیت۔ ان کے کلام میں درد کی لو اور انسانیت کی شبنم کا پرتو ہے۔ میر نے غمِ عشق کو مردانہ وار ٹھہرایا ہے اور غم آفاق کو ہمت مردانہ کی آہنی ڈھال بتایا ہے وہ ڈوب کر ابھر سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی آگے چلنے کا مصمم عزم رکھتا ہے۔ یہی انسانیت اور مرد کامل کی اولین خصوصیت تصور کی جاتی ہے۔ میر اپنی ناکامیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میرؔ کی عظمت کا راز یوں ہی نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ ان کی شاعری کے خدوخال کو نہ سمجھا جائے۔ ان کی شاعری میں بہت سی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے مزین ہو کر ان کی شاعری ایک آفاقی اور عالمی شاعری بنتی ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کون کون سے عناصر ہیں جن کی خمیر سے میر کی شاعری کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔ آیئے ان عناصر کے بارے میں معلوم کریں۔ ان کی شاعری میں فکر کا عنصر غالب ہے جس میں جذبات کی منظر کشی کی گئی ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی حقیقتیں اپنے پورے وجود کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں اس میں شاعر کے جذبات واحساسات بھی یقیناً معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میر نے اس فریضہ کو بخوبی انجام دیا ہے۔ مثلاً اگر کسی شیشے کے کارخانے کو دیکھ کر انھیں محسوس ہوتا ہے کہ پھونک مارنے میں ذرا سی بے احتیاطی مصنوعات کی شکل بگاڑ سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی انھیں دنیا کے معاملات کا بھی احساس ہوتا ہے جہاں ہر ہر قدم سنبھل کر رکھنا پڑتا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

میرؔ کی دوسری خوبی یہ تصور کی جاتی ہے کہ وہ جو موضوع اپنی شاعری کے لیے انتخاب کرتے ہیں اس میں ایک خاص قسم کی معنویت اور اہمیت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میر کسی خاص نظریے کے شاعر نہیں۔ زندگی میں پیش آنے والا ہر بڑا اور چھوٹا تجربہ ان کے دل پر اثر کرتا ہے اور وہ ان کے شعر میں ڈھل جاتا ہے ان کی شاعری میں اکثر و بیشتر عشق کے تجربات نظر آتے ہیں اور یہ وہ تجربہ ہے جو ہر شخص کے دل پر کبھی نہ کبھی اثر انداز ہوتا ہے اسی لیے میر کی شاعری ہر دل

کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ میر اپنی آپ بیتی سناتے ہیں تو وہ جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔

میرؔ کی زبان ایسی ہے جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی سے باتیں کرتا ہے یعنی بول چال کی زبان میں ان کی شاعری بہت اثر انگیز ہوتی ہے۔ دیکھیے ایک شعر جس میں پھول کی بے ثباتی کا ذکر کرتے ہیں۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

پیکر تراشی میں میرؔ کمال رکھتے ہیں۔ یعنی لفظوں کے ذریعے تصویر بنا کر حسن و خوبصورتی سے پیش کرنا۔ یہ ان کی فنکاری کی دلیل ہے۔ ایک سنی ہوئی چیز کے بارے میں محسوس کرنے اور دیکھی ہوئی چیز کے احساس کرنے دونوں میں فرق ہے۔ میر پیکر تراشی کے ذریعے سامنے وہ منظر لا دیتے ہیں جسے قاری اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

چلتے ہو تو چمن کو چلیے ' سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں' پھول کھلے ہیں' کم کم باد و باراں ہے
رات محفل میں تیری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

اس کے علاوہ تشبیہ و استعارہ' مجاز مرسل' صنعت تلمیح وغیرہ کی بہت سی مثالیں ان کی شاعری میں موجود ہیں۔

میر نے فارسی نثر میں دو کتابیں لکھیں ایک ''ذکر میر'' جس میں ان کے حالاتِ زندگی کی تفصیل ہے اور دوسری مشہور کتاب ''نکات الشعراء'' جس میں شعرائے اردو کے تذکرے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

5. میر کی شاعری کس شہر کے زبان پر مبنی ہے؟
6. ہستی اپنی حباب کی سی ہے اس کا دوسرا مصرع لکھیے۔
7. ریختے کی شروعات میر نے کس کے کہنے پر کی تھی؟
8. میر شعر نہیں کہتے باتیں کرتے ہیں۔ کس کا قول ہے؟
9. میر کی شاعری کو کس ناقد نے سحر یا طلسم سے تعبیر کیا ہے؟
10. ''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام'' اس کا مصرع ثانی لکھیے۔

1.5 میر کی غزل (1)

جب نام ترا لیجیے، تب چشم بھر آوے — اس زندگی کرنے کو، کہاں سے جگر آوے!
واعظ نہیں، کیفیتِ مے خانہ سے آگاہ — یک جرعہ بدل، ورنہ یہ منديل دھر آوے
صناع ہیں سب خوار، ازاں جملہ ہوں میں بھی — ہے عیب بڑا اس میں جسے کچھ ہنر آوے
اے وہ! کہ تو بیٹھا ہے سرِ راہ یہ زنہار — کہیو! جو کبھی میر بلا کش ادھر آوے
مت دشتِ محبت میں قدم رکھ کر خضر کو — ہر گام پہ اس رہ میں، سفر سے حذر آوے

1.5.1 مجموعی تاثر

غزل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میر نے یہ غزل ایک خاص انداز اور مخصوص لہجے میں کہی ہے۔ عشق کی آزمائشوں اور محبت میں گرفتار لوگوں کی رودادِ زندگی اس میں موجود ہے۔ شراب کی مستی اور شراب نوشوں کی کیفیت کا اظہار بھی اس میں بخوبی نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی دنیا میں فن کاروں اور ہنر مندوں کی ناقدری کا شکوہ بھی موجود ہے۔ یہ ایک عالمی حقیقت ہے کہ جس کے پاس کوئی ہنر یا فن ہوتا ہے لوگ اس کی برائی بھی زیادہ کرتے ہیں۔ اس ہنر کو شاعر نے عیب سے تعبیر کیا ہے۔ پھر اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس عشق کی وادی میں ہرگز ہرگز قدم مت رکھو کیونکہ جو اس سفر کے لیے گھر سے نکلتا ہے اسے مختلف آزمائشوں اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے اور اس راہ میں تو قدم رکھنے سے حضرت خضر علیہ السلام بھی احتراز کرتے ہیں۔ اس میں ایک خوبصورت تاریخی بیان اور بہترین پیرایہ اظہار بھی موجود ہے۔ علم بیان کی ایک صنعت بھی اس کے آخری شعر میں موجود ہے، جسے علم بیان میں تلمیح کہتے ہیں۔ یہ پوری غزل نہایت آسان اور رواں ہے۔ الفاظ سلیس اور انداز بیان متاثر کن ہے۔ میر کا یہی خاص رنگ و آہنگ ہے جس کی وجہ سے وہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں لیجنڈ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرؔ نے اس پوری غزل میں واعظ صناع، بلا کش، عاشق اور حضرت خضر کا ذکر کر کے ایک پوری معاشرتی زندگی کی عکاسی کی ہے جہاں یہ تمام افراد اپنی زندگی کا احساس اپنے اپنے انداز سے دلاتے ہیں۔

1.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: کسی بھی شاعر کی تخلیق کو سمجھنے کے لیے اس کی زندگی اور اس کے دور کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ میر

تقی میر کی زندگی غموں میں گزری' ان غموں میں ایک غم ان کی عشق میں ناکامی بھی رہی۔ اس عشق میں انھیں جو تجربات حاصل ہوئے انھیں بیان کرتے ہیں اور ان کے عشق کی شدت کا اندازہ اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔ میر نے اس شعر میں اپنی اسی کیفیت کا اظہار کیا ہے یعنی جب عاشق اپنے محبوب کا نام لیتا ہے تو نام لیتے ہی اس کے عشق میں یا اس کی جدائی میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور جب اس طرح کی کیفیت سے عاشق دوچار ہوتا ہے تو پوری زندگی اسی حالت میں گزارنے کے لیے اس کے پاس کہاں سے حوصلہ آئے۔ یہاں شاعر نے حوصلہ اور ہمت کے لیے لفظ جگر استعارہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ جس انسان کی زندگی میں عشق کی ناکامی اور حرماں نصیبی نے اس انداز سے جگہ بنالی ہو جو اپنے محبوب کی جدائی میں اس طرح مغموم رہتا ہے کہ جب بھی کبھی اس کا نام اس کی زبان پر آتا ہے تو اس کا دل بھر آتا ہے اور آنکھ نم ہو جاتی ہے تو یہ پہاڑ جیسی زندگی اسی حالت میں گزارنے کے لیے کہاں سے ہمت اور جرأت لائے گا۔ اس شعر میں غم کی مصوری دکھائی دیتی ہے اور اس فن میں تو میر کو مہارت حاصل ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں میر نے واعظ کی ریاکاری اور ناتجربہ کاری کو بیان کیا ہے۔ کیونکہ واعظ کا کام صرف وعظ و نصیحت کرنا ہے' اسے عملی میدان کا تجربہ نہیں ہے۔ اسے اس کیفیت کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ شرابی اور مے میں کون سا رشتہ ہے اور میخوار کو کتنی سرمستی اور سرشاری حاصل ہوتی ہے اس کا اندازہ واعظ کو ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میخانہ کی کیفیت اور اس کی سرمستی اور سرور سے واعظ کو واقفیت نہیں ہے۔ اس سے قبل کہ میں میخانے کی مستی سے سرشار ہوں اور واعظ چلا آئے۔ اے ساقی تو کم از کم شراب کا ایک گھونٹ ہی پلا دے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عمامہ پوش اور جبہ و دستار والا واعظ اس میخانے میں چلا آئے اور شراب کے ایک گھونٹ سے بھی محروم ہو جاؤں۔ یہاں جرعہ کے معنی گھونٹ اور مندیل کا مطلب پگڑی یا عمامہ ہے۔ جسے شاعر نے علامت کے طور پر واعظ کی نشاندہی کے لیے استعمال کیا ہے۔ یہی تو میر کی خوبی ہے کہ وہ مختصر لفظوں میں معانی کی ایک دنیا پیش کر دیتے ہیں اور مختلف صنائع ادبی کا اظہار بھی بخوبی کرتے ہیں۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر نے اپنے زمانے کی ناقدری اور حق تلفی کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ جس دور کی یہ غزل ہے اس دور میں دہلی اور اس کے آس پاس افراتفری اور معاشی و سیاسی انتشار اور اقتصادی کشمکش موجود تھی۔ اس دور میں جو بھی فنکار تھے انھیں گھاس ڈالنے والا کوئی نہیں تھا۔ ان کی قدردانی کا جذبہ لوگوں میں مفقود ہو چکا تھا۔ شاعر اس شعر میں اسی جانب اشارہ کر رہا ہے کہ یہاں جو بھی فنکار' کاریگر اور ہنرمند افراد ہیں سبھی ذلیل و خوار ہیں یعنی ان کی قدر و منزلت نہیں ہے اور اسی وجہ سے معاشی طور پر پریشان ہیں اور ذلت و رسوائی کی لعنت میں مبتلا ہیں۔ اور

میں بھی (میر) اسی صف میں کھڑا ہوں کیونکہ میں بھی تو ایک فنکار ہوں۔ ایسے ماحول میں ہنرمند ہونا ایک عیب بن چکا ہے۔ ایک ہی مصرع میں لفظوں کے اضداد کا بیان یعنی عیب اور ہنر کا ذکر کر کے شعری حسن پیدا کیا ہے۔ یہاں صناع کا مطلب کاریگر' فنکار اور ہنرمند ہے۔ جملہ کا معنی تمام' پورا اور مکمل ہوتا ہے اس شعر میں میر نے اپنی ناقدری کا شکوہ کرتے ہوئے تمام ہنرمندوں کی ذلت و رسوائی اور ندامت و شرمندگی کے احساس کو پیش کیا ہے جو میر کے دور میں موجود تھے۔

چوتھا شعر: یہ شعر اوپر والے شعر سے مربوط ہے۔ یعنی ہنرمندوں کی ناقدری کا جس کا مذکورہ شعر میں بیان کیا گیا ہے اس شعر کا تعلق اوپر والے ہی شعر سے ہے۔ میر کہتے ہیں کہ اے فنکار جو تم جس راہ پر بیٹھے ہو اور تمہارے ساتھ جو لوگوں کے برتاؤ ہو رہے ہیں اس راہ پر میر ہرگز ہرگز نہیں جائے گا۔ کیونکہ میر بلاکش یعنی شراب نوش میر کو اس بات کا علم ہے کہ کس جگہ اور کہاں جانا چاہیے۔ میں ہرگز ہرگز اس راہ پر نہیں جاؤں گا۔ اس لیے تم جس سر راہ بیٹھے ہو وہ راہ میر کی راہ سے جداگانہ ہے۔ یہاں میر اپنی خودداری اور اعلیٰ ظرفی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنی الگ روشِ زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہاں زنہار کا مطلب ہرگز ہوتا ہے اور بلاکش کا معنی مصیبت برداشت کرنے والا ہوتا ہے۔ شاعر نے اپنی پوری بات کی وضاحت چند لفظوں میں کر دی ہے اور اپنی انفرادیت کو عمومیت سے ممیز کر دیا ہے۔ یہی تو میر کی صناعی اور استادی ہے جس کی وجہ سے انھیں خدائے سخن کہا جاتا ہے۔

پانچواں شعر: میر تقی میر نے محبت کے راہوں کی تلخی کو بڑی شدت اور حدت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کیونکہ وہ عشق کی وادی کی سیر کر چکے تھے اور اس راہ میں جو جو مشکلات انھیں پیش آئیں انھیں آنے والے عاشقوں کے لیے تنبیہ کے طور پر اور عبرت کے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ براہ راست اپنے ذاتی تجربے اور احساسات کو بیان کرنا نہیں چاہتے بلکہ وہ حضرت خضر علیہ السلام کی زبان سے یہ کہلوانا چاہتے ہیں کہ حضرت خضر جو بھولے بھٹکے راہی کو راستہ بتانے کا کام کرتے ہیں وہ بھی اس راہ میں سفر کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ شاعر اسی بات کو اس انداز میں کہتا ہے کہ تم محبت کی وادی میں قدم مت رکھو یعنی محبت کے چکر میں مت پڑو۔ کیونکہ اس وادی میں سفر کرنے سے حضرت خضر علیہ السلام جیسی شخصیت کو بھی پرہیز ہے۔ یعنی حضرت خضر علیہ السلام کو ہر موڑ پر یعنی ہر گام پر سفر کرنے سے ڈر محسوس ہوتا ہے اور اسی ڈر کی وجہ سے اس عشق کی وادی میں حضرت خضر علیہ السلام بھی نہیں داخل ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں شاعر نے صنعت تلمیح سے کام لیا ہے جس میں کسی تاریخی واقعے کی طرف ذکر ہوتا ہے اور یہاں حضرت خضر کا ذکر بھی اسی تاریخی واقعے کی طرف ہے جس سے حضرت خضر کی ذات منسوب ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

11. جرعہ اور مندیل لفظوں کے معنی بتایئے۔

12. اس غزل کے پہلے شعر میں تیرا نام سے شاعر کا اشارہ کس جانب ہے؟

13. غزل کے آخری شعر میں حضرت خضر کا استعمال کر کے کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟

14. ممیّز کے کیا معنی ہیں۔

1.6 میر کی غزل (2)

پتا پتا ' بوٹا بوٹا ' حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے' گل ہی نہ جانے' باغ تو سارا جانے ہے
عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے' اپنا وارا جانے ہے
چارہ گری بیماری دل کی ' رسم شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی ' اس درد کا چارا جانے ہے
مہر و وفا و لطف و عنایت' ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ' رمز و اشارہ جانے ہے
عاشق تو مردہ ہے ہمیشہ دیکھے سے جی اٹھتا ہے
یار کے آجانے کو یکا یک ' عمر دوبارہ جانے ہے
کیا کیا فتنے ؟ سر پر اس کے' لاتا ہے معشوق اپنا
جس بے دل' بے تاب و تواں کو عشق کا مارا جانے ہے
تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا ؟ میر بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس نے' آبِ گوارا جانے ہے

1.6.1 مجموعی تاثر

اس پوری غزل میں شاعر نے عاشق کی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ ہمارے دل کی جو

کیفیت ہے اس سے باغ کے تمام پتے' بوٹے واقف ہیں مگر پھول کو اس کا علم نہیں۔ یعنی ایک طرح سے طنز کا تیر چلا کر شاعر اپنے محبوب پر نشانہ سادھنا چاہتا ہے۔ اس غزل میں عاشق کی سادگی اور اس کا بھولا پن دکھایا گیا ہے جو عشق میں سب کچھ ہار کر نفع کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ یعنی اس کی جان بھی اس راہ میں چلی جائے تو بھی اسے فائدہ ہی نظر آتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد تو کم از کم حاصل ہو گیا۔ اس میں عاشق اور معشوق کی کیفیت' ان دونوں کی ملاقات اور ملاقات کے بعد کی کیفیت' عاشق پر عشق کے اثرات' دلبروں کے ناز و ادا کو بہت ہی خوبصورت پیرائے میں میر نے پیش کیا ہے۔ یہ پوری غزل موسیقیت سے لبریز ہے۔ لفظوں کے انتخاب میں میرؔ نے اُستادانہ مہارت سے کام لیا ہے۔ یہ غزل ان کی مشہور ترین غزلوں میں سے ایک ہے جس کے کئی مصرعے ضرب الامثال کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پوری غزل شعری حسن اور ادبی خوبیوں سے بھرپور ایک مکمل داستان عاشق و معشوق ہے جس میں عاشق نے اپنے محبوب کی کج ادائی' بے رخی' بے وفائی اور سرد مہری کو بیان کر کے اپنے دلی جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔

1.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: میر تقی میر ترجمان غم کہے جاتے ہیں جن کے عشق کا تصور بہ نسبت دوسرے شعرا ذرا مختلف ہے۔ یعنی ان کے یہاں عشق کی داخلی کیفیت کا اظہار بڑی شدت سے دکھائی دیتی ہے۔ اس شعر میں میر کہتے ہیں کہ میرے حالِ زار کے متعلق باغ کے پتے' بوٹے اور تمام قسم کے چھوٹے چھوٹے درخت جو باغ میں موجود ہیں' آگاہ ہیں۔ لیکن ایک پھول باغ کا ایسا ہے جو میری حالت سے بے خبر ہے۔ شاعر نے باغ پتا پتا' بوٹا بوٹا کہہ کر استعاراتی انداز میں یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ میں جہاں رہتا ہوں اس کے آس پاس کے بچے' جوان اور بوڑھے سبھی میری عشق کی کیفیت سے آگاہ ہیں اور ہماری عشق میں کیا بری حالت ہو رہی ہے اس سے سبھی لوگ واقف ہیں۔ لیکن جس شخص کو میری اس کیفیت کا احساس ہونا چاہیے وہ میری حالت سے بے خبر ہے۔ یعنی میرا محبوب میری محبت کی تڑپ اور عشق کی ٹیس سے بے خبر ہے۔ شاعر نے یہاں پتا بوٹا اور باغ کہہ کر اپنے آس پاس کے افراد کو مراد لیا ہے اور ''پھول'' کہہ کر اپنا محبوب مراد لیا ہے جس سے وہ عشق کرتا ہے۔ یہ شعر شعری حسن پر پورا اترتا ہوا نظر آتا ہے اور لفظوں کے انتخاب میں شاعر نے نہایت چابکدستی اور دور اندیشی سے کام لیا ہے۔ اپنی بات براہ راست نہ کہہ پھولوں اور پتوں کے پردے میں استعاراتی انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ بھی شعر کی خوبی ہے کہ براہ راست بات نہ کی جائے اور قاری پر اس

شعر کا مطلب بخوبی واضح ہو جائے۔ میر اس فن میں کمال رکھتے ہیں۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ عاشق جیسا سادہ لوح اور بھولا بھالا انسان تو شاید ہی دنیا میں کوئی ہو جو نقصان کا سودا کر کے خوشی و مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق ایک ایسا حیوانِ ناطق ہے جو عشق میں سب کچھ قربان کر دیتا ہے یہاں تک کہ اپنی جان قربان کر دینے کو بھی تیار رہتا ہے اور اپنی اس قربانی کو وہ نفع سے تعبیر کرتا ہے۔ اپنے جی کے نقصان کو وہ فائدہ تصور کرتا ہے۔ یہاں زیاں سے مراد نقصان اور وارا کا مطلب نفع ہے۔ میر نے اس شعر میں عاشق کی کیفیت نہایت مختصر لفظوں میں خوبصورتی سے بیان کر دی ہے۔ یہ شعر کتنا سلیس اور رواں ہے اس کا اندازہ اس شعر کی قرأت سے کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس میں ایک جہانِ معانی پوشیدہ ہے۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ میں جس شہر میں رہتا ہوں۔ اس شہر کے لوگوں میں بیماروں کی عیادت اور مزاج پرسی کی رسم نہیں ہے۔ سبھی اپنے آپ میں مگن ہیں۔ دل کے بیمار کی چارہ گری کرنے والا یہاں کوئی نہیں ہے۔ اگر درد کا احساس یہاں کے لوگوں کو ہوتا تو اسی شہر میں میرا محبوب بھی رہتا ہے وہ بھی اس درد کی چارہ گری کو جانتا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اس شہر نامراد میں ہر شخص بے حس اور بے درد ہے۔ اس شہر سے مراد دنیا ہے اور اس دنیا میں رہنے والے عشق کی رسم میں یقین نہیں رکھتے وہ عشق کی کیفیات سے محروم ہیں ورنہ میرا دلبر ناداں بھی اس عشق کی کیفیت سے آگاہ ہوتا۔ مگر یہاں تو وہ بھی ہمارے بیمار دل کا مداوا نہیں کر سکتا کیوں کہ اسے اس کا علم ہی نہیں ہے۔ یہاں دلبر ناداں کہہ کر شاعر نے اپنے محبوب کی طرف اشارہ کیا ہے۔

چوتھا شعر: یہاں کے لوگ یعنی اس شہر کے لوگ انسانی اقدار سے محروم ہیں نہ ان کے پاس وفاداری ہے اور نہ مروت، نہ ہی لطف و عنایت ہے اور مہربانی کی صفت سے متصف ہیں۔ ہاں ان لوگوں کو ایک ہنر ضرور آتا ہے وہ یہ کہ عاشق پر طنز کرنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ جب عاشق عشق کی آگ میں جلتا ہے اور عشق کی داخلی کیفیات سے دوچار ہوتا ہے اور اس وقت جو اس کے چہرے پر تاثر پیدا ہوتا ہے (بے خودی کی کیفیت) تو اس کیفیت کو دیکھ کر یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں اور عاشق صادق پر طنز کے تیر برساتے ہیں۔ کوئی طنز کرتا ہے کوئی کنایہ اور رمز و اشارہ کے ذریعے سیدھا اس پر نشانہ سادھتا ہے۔ شاعر نے اس شعر میں ایک طرف انسانی قدروں کی بنیادی صفات گنوایا ہے تو دوسری طرف انسانوں کے ذریعے مطلوبہ شخص پر مختلف طریقے سے طنز کیے جانے کے لیے جو طریقے اور جو صنعت استعمال کی جاتی ہے اسے بھی نہایت عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔ اس شعر میں دنیا کی پوری حقیقت اور انسانوں کی فکری اور فطری جبلت کا اظہار بھی موجود ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں میر نے عاشق کی اس کیفیت کو بیان کیا ہے جو عاشق پر ہمہ وقت طاری رہتی ہے۔یعنی ہمیشہ دم بے خود' مبہوت' خمار آلودہ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتا ہے۔یعنی اس کی حالت ایک مردے کی سی رہتی ہے۔جس میں زندگی کی رمق نظر نہیں آتی۔مگر جب بھی وہ اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو نشے سے باہر آ جاتا ہے یعنی وہ زندہ ہو جاتا ہے۔دوسرے مصرعے میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب کے آ جانے سے اچانک اس کے جسم میں جان پڑ جاتی ہے۔اور وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب مجھے دوبارہ زندگی مل گئی ہے۔شاعر نے اس شعر میں عاشق کی کیفیت اس انداز سے بیان کی ہے کہ شاید ہی دوسرے شعرا کے یہاں اس طرح کا گہرا جذباتی اظہار پایا جاتا ہوگا۔دیگر شعرا کے یہاں یہ تو ملتا ہے کہ جب عاشق اپنے محبوب سے ملتا ہے تو وہ کیا بولتا ہے اور کیا بھول جاتا ہے لیکن میرؔ نے اس کی زندگی کو موت سے تعبیر کی ہے اور محبوب کی اس کے سامنے آمد کو یکا یک زندگی بتایا ہے جو اسے دوبارہ مل جاتی ہے۔یہی تو شاعری کا کمال ہے کہ وہ ایسے نکات پیش کرتی ہے جس میں دنیا کی پوری حقیقت صرف ایک مصرع میں محفوظ ہو جاتی ہے۔اس شعر میں مردہ' جی اٹھنا اور دوبارہ زندگی مل جانا ان تینوں کیفیات کا اظہار عمدگی سے کیا گیا ہے اس کا اندازہ آپ اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔

چھٹا شعر: اس شعر میں فنکار اس کیفیت کی جانب اشارہ کرتا ہے جس سے عاشق دوچار ہوتا ہے۔یعنی نہ جانے کون کون سے فتنے' کون کون سی مصیبتیں محبوب اپنے عاشق کے لیے لے کر آتا ہے اور یہ فتنے ایک ایسے شخص پر ڈالتا ہے جو فطری طور پر ناتواں' کمزور' بے دل اور بے جان ہوتا ہے۔اس کے پاس اتنی صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ان تمام فتنوں کو برداشت کر سکے کیونکہ وہ نحیف اور کمزور ہے مگر اس کا محبوب اس بات سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔عاشق کے دل پر کیا گزرتی ہے اسے اس کا احساس ہی نہیں ہوتا ہے۔بس اپنی ادائے دلبرانہ سے اسے مجروح اور مضمحل کر کے رکھ دیتا ہے۔میر کہتے ہیں کہ عاشق کی کیفیت بڑی قابل رحم ہوتی ہے اس پر پہلے ہی سے ظلم کے پہاڑ عشق کے طفیل میں ٹوٹتے رہتے ہیں اوپر سے محبوب کے مختلف انداز کے فتنے' مصیبت بالائے مصیبت ثابت ہوتے ہیں۔

ساتواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ محبوب کتنا ظالم ہے اس کی انتہا نہیں ہے۔وہ کہتا ہے کہ محبوب ہمارے خون کا کتنا پیاسا ہے۔وہ اپنے محبوب کے تیز تلوار کی دھار کو ایک آبِ گوارہ تصور کرتا ہے۔یعنی اس تلوار میں جو تیز دھار ہے اسے آبِ گوارہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔یعنی اسے قبول کر لینے کو آبِ گوارہ بتایا ہے۔میر اس کے تیغ وظلم کی دھار کو بخوشی گوارہ کرنے کو تیار رہے کیونکہ اس کی نظر میں عشق کی آگ میں جلنے سے بہتر ہے کہ وہ محبوب کے تلوار کا نشانہ بن جائے۔یہی عاشق کے عشق کی معراج ہے۔اس شعر میں تلخی کش کا مطلب مصائب اٹھانے والا دم دار کا مطلب تیز ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

15. جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے

اس مصرعے میں ''باغ'' سے کس جانب اشارہ کیا گیا ہے۔

16. غزل کے چوتھے شعر میں رمز و اشارہ کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے؟

1.7 خلاصہ

میر تقی میرؔ کا نام محمد تقی اور تخلص میرؔ تھا۔ 1723ء میں وہ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا فوج میں ملازم تھے لیکن والد جن کا نام محمد علی تھا ایک اللہ والے بزرگ تھے۔ محمد علی خود صوفی تھے اور صوفیوں سے دوستی رکھتے تھے۔ ابھی میر کی عمر صرف گیارہ سال کی تھی کہ ان کے والد محمد علی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے سوتیلے بھائیوں نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اور ان کی زندگی دشوار بنا دی۔ اب وہ آگرہ سے روزی کی تلاش میں نکل پڑے اور دہلی کو سکونت بنایا۔ دلی میں میر نے سراج الدین خاں آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔ آرزو میر کے رشتہ دار تھے۔ انھیں کے کہنے پر میر نے ریختہ کے طرز پر غزل کہنے کا آغاز کیا۔ دلی کی تباہی کے بعد میر بھی دوسرے شعراء کی طرح لکھنؤ کوچ کر گئے اور وہاں نواب آصف الدولہ کے دربار سے منسلک ہو گئے جہاں انھیں ماہانہ تین سو روپے وظیفہ بھی ملنے لگا۔ لیکن نواب کے ساتھ ان کی زیادہ دنوں تک نہیں نبھی۔ اور وہ نواب سے دور ہو گئے۔ ان کی پوری زندگی غم و خزاں و ملال اور مصائب کا مجموعہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کی شاعری میں یہ تمام موضوعات غیر دانستہ طور پر داخل ہو گئے۔ ان کی شاعری میں دنیا کی حقیقت، عشق کی بالادستی اور انسانی اقدار کی بلندی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری درد کی شاعری ہے جہاں حزن و ملال اور غم و اندوہ کی ایک دنیا موجود ہے۔ میر کو اردو شاعری میں خدائے سخن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور انھیں اردو کا سب سے بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ میر نے اپنی شاعری میں واعظوں کی ریاکاری، محبوب کی جفاپسندی اور بے وفائی، اور عشق کی بالادستی ہر جگہ دکھائی ہے۔

میرؔ کی شاعرانہ عظمت کی دلیل ان کی صداقت بیانی ہے جو زندگی کا حصہ ہے۔ وہ بول چال کی زبان میں شاعری کرتے ہیں جو سیدھے دل میں اتر جاتی ہے۔ وہ ایک قناعت پسند، خوددار اور نیک دل انسان تھے۔ انھوں نے زندگی کی تلخیوں کو جھیلا اور اس سے ہمہ وقت مقابلہ کرتے رہے اور اپنے مشن سے کبھی بھی دور نہ ہو سکے۔ بڑے بڑے شاہانِ وقت اور امراء زمانہ سے بھی مرعوب نہ ہو سکے اور ان کے سامنے دست سوال دراز کرنا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ

ان کی زندگی میں کتنے ایسے مواقع آئے جہاں وہ معاشی طور پر پریشان نظر آئے لیکن انھوں نے فاقہ کشی کو ہاتھ پھیلانے پر ترجیح دی۔ان کی شاعری میں تشبیہ واستعارہ' کنایہ اور صنعت تلمیح کی پوری جلوہ گری نظر آتی ہے۔انھوں نے دو مشہور کتابیں نثر میں لکھیں ایک ''ذکر میر'' اور دوسری ''نکات الشعراء''۔یہ دونوں کتابیں فارسی زبان میں ہیں۔ 1810ء میں لکھنؤ میں ان کا انتقال ہوگیا۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے؟

1. میر کی تعلیم اور ان کے کردار کے اوصاف بیان کیجیے۔
2. میر کی غزل کی خصوصیات مختصراً تحریر کیجیے۔
3. میر نے آگرہ سے نکل کر کہاں کا سفر کیا۔اس سفر کی داستان لکھیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے؟

1. میر تقی میر کی حیات پر روشنی ڈالیے۔
2. میر تقی میر کی شاعری پر سیر حاصل بحث کیجیے۔

1.9 فرہنگ

اوصاف	وصف کی جمع خوبیاں۔اچھائیاں
مخمس	وہ نظم جس میں ہر بند پانچ مصرعوں کا ہو
ضعف بصری	دیکھنے کی قوت میں کمی۔قوت بینائی کی کمزوری
دل شکستگی	رنجیدگی' افسردگی' مایوسی
بصارت	قوتِ بینائی' دیکھنے کی طاقت
فارغ البالی	آسودگی' اطمینانی کیفیت
معترضین	اعتراض کرنے والے' روک ٹوک کرنے والے
سوزش درونی	اندرونی جلن' دل کی سوزش

فراغ	فرصت، نجات، سکھ
رمق	تھوڑی سی جان، اخیر سانس، ذرا سا، چاشنی کا کچھ اثر
صناع	کاریگر، ہنر مند، فنکار
جرعہ	گھونٹ
مندیل	پگڑی، عمامہ، طلائی، پٹکا، رومال
بلاکش	آفت جھیلنے والا، مصیبت برداشت کرنے ولا
تلمیح	ایسی صنعت جس میں کسی تاریخی واقعے کا ذکر ہو
ممیّز	تمیز کیا گیا، پہچانا گیا
زیاں	نقصان۔گھاٹا
چارہ گری	کام بنانے والا، کام کرنے والا، معالج
وارا	بچت، کفایت، فائدہ، نفع، بیماری سے افاقہ
رمزواشارہ	آنکھوں بھوؤں سے اشارہ کرنا۔اشارہ
بےتاب وتواں	کمزور، نحیف، جو بوجھ نہ اٹھا سکے
تلخی کش	مصائب برداشت کرنے والا
آب تیغ	تلوار کی دھار
داخلی کیفیات	دلی جذبات واحساسات
دنیاومافیہا	دنیااور جو کچھ اس میں ہے
مبہوت	بےخود، حیران، ہکا بکا
مضمحل	کمزور، لاغر، اداس، رنجیدہ

1.10 معاون کتابیں

1. انتخاب کلامِ میرؔ — مولوی عبدالحق
2. اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — پروفیسر احتشام حسین

4. اردو ادب کی تاریخ عظیم الحق جنیدی

5. اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار

1.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. میر تقی میر کی پیدائش 1723 کو آگرہ میں ہوئی ؟

2. فارسی زبان میں

3. دہلی میں

4. ان کے سوتیلے بھائیوں نے

5. دہلی کی بول چال کی زبان پر

6. یہ نمائش سراب کی سی ہے

7. خان آرزو کے کہنے پر

8. پروفیسر نورالحسن نقوی کا

9. رام بابو سکسینہ کا

10. آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

11. جرعہ کے معنی گھونٹ اور مندیل کا مطلب پگڑی اور عمامہ ہے۔

12. اپنے محبوب کی جانب

13. صنعت تلمیح

14. تمیز کیا گیا' پہچانا گیا۔

15. محبوب کی جانب

16. آنکھوں یا بھوؤں سے اشارہ کرنے کے معنی میں

اکائی 2: خواجہ میر درد

ساخت

2.1 اغراض ومقاصد

2.2 تمہید

2.3 خواجہ میر درد کی حیات

2.4 میر درد کی شاعرانہ خصوصیات

2.5 میر درد کی غزل (1)

2.5.1 مجموعی تاثر

2.6 درد کی غزل (2)

2.6.1 مجموعی تاثر

2.6.2 اشعار کی تشریح

2.7 خلاصہ

2.8 نمونہ امتحانی سوالات

2.9 فرہنگ

2.10 معاون کتابیں

2.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

2.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں خواجہ میر درد کی شخصیت اوران کی شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کیا جائے گا۔خواجہ میر درد کی دو غزلیں اس اکائی میں شامل کی جائیں گی اوران دوغزلوں کی تشریح اور تبصرہ بھی پیش کیا جائے گا۔مشکل الفاظ کے معانی بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں ۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد توقع کی جاتی ہے کہ آپ میر درد کی شاعری کی خصوصیات اوران کی زندگی کے مختلف جہات سے واقف ہوجائیں گے۔

2.2 تمہید

اٹھارہویں صدی میں جن شعراء نے شہرت و ناموری حاصل کی ان میں خواجہ میر درد کا نام سرفہرست آتا ہے۔ان کی مقبولیت کی وجہ ان کے عارفانہ کلام اور تصوف و معرفت سے لبریز شعری تخلیقات ہیں۔ان کی شاعری اپنے زمانے کی روایتی روش سے یکسر مختلف ڈگر پر رواں دواں نظر آتی ہے جہاں کائنات کی حقیقتیں اور متصوفانہ جہتیں بخوبی نظر آتی ہیں۔ان کا تعلق کسی خاص گروہ یا ادبی حلقے سے نہیں تھا بلکہ انھوں نے اپنی شاعری کو ایک الگ نہج پر اور ایک نئے تیور کے ساتھ پیش کر کے اہل ادب کو معترف ہونے پر مجبور کیا۔

2.3 خواجہ میر درد کی حیات

خواجہ میر درد 1721ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب تھا جو اپنے دور کے مشہور صوفی شاعر تھے۔درد کو تصوف کی بنیادی تعلیمات ان کے والد کے توسط سے حاصل ہوئی۔چونکہ خاندان میں تصوف و معرفت کا چرچہ تھا اور اسی ماحول میں درد کی پرورش ہوئی تو ظاہری بات ہے اسی کا اثر درد کی شاعری اور ان کی زندگی پر پڑنا لازمی تھا۔درد نے عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر حاصل کی۔والد کے اصرار پر انھوں نے وسط جوانی میں علوم رسمیہ کی تحصیل کی۔عقائد، معقولات و منقولات اصول تصوف وغیرہ پر دسترس حاصل کی۔علاوہ ازیں دیگر علوم ضرورت کے مطابق حاصل کیے۔درد کی تصانیف اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ درد کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں پر کامل عبور حاصل تھا۔درد کو اپنے والد کی طرح اکتسابی علوم کے بجائے وھبی علوم کی دولت میسر تھی۔انھوں نے درسی علوم سے بے نیازی اختیار کر لی تھی اور یہ روایت انھیں وراثت میں ملی تھی۔درد نے عہد جوانی میں ہی تصوف کے مسلک کو اختیار کر لیا۔وہ ایک بزرگ عالم اور ذہین شخص تھے۔انھوں نے فارسی میں کئی کتابیں لکھی تھیں۔درد کو فن، موسیقی میں بھی خاصا شغف حاصل تھا۔اور شاعری میں تو کامل شمار ہوتے تھے۔جب دلی کی حالت بہت خراب ہوگئی اور سبھی اسے چھوڑ کر باہر جانے لگے۔اس وقت بھی درد نے اپنی چوکھٹ نہیں چھوڑی۔ان کا ایک مختصر سا دیوان ملتا ہے جس میں اردو فارسی کی غزلیں ہیں لیکن ان کی شاعری میں تصوف کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔

خواجہ میر درد نے اپنے زمانے کے دو استادوں سے فارسی زبان و ادب کا سبق لیا۔یہ دو استاد مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزو تھے۔سراج الدین خاں آرزو اس زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔اور میر تقی میر کے ماموں تھے۔اس زمانے میں کوئی شخص اس وقت تک ماہر نہ سمجھا جاتا تھا جب تک اس نے خاں آرزو سے نہ پڑھا ہو۔علاوہ

ازیں درد نے اپنے والد خواجہ ناصر عندلیب سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ مذہبی علوم قرآن، علم حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف میں مہارت حاصل کی۔ موسیقی سے لگاؤ اور اس میں مہارت ہونے کی وجہ سے اس زمانے کے بڑے بڑے موسیقاران سے فن موسیقی کی تعلیم لینے آتے تھے۔ ان کے گھر پر ہر ماہ کی دوسری اور چوبیس تاریخ کو سماع کی محفل منعقد ہوتی تھی۔ جس میں بڑے بڑے موسیقار اور قوال اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ان محفلوں میں بڑے بڑے امیر، وزیر اور بادشاہانِ وقت بھی شریک ہوتے تھے۔

درد غیر معمولی خوبیوں کے حامل تھے۔ سیدوں کے ایک اعلیٰ گھرانے سے درد کا تعلق تھا جن کے ماحول میں مذہب سے دلچسپی اور خدا کی محبت بسی ہوئی تھی۔ جن کے آباواجداد مغل دربار میں اونچے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ اس کے باوجود درد کی طبیعت میں خدا کا خوف، مذہب کی پابندی، بے نیازی اور حم اور ہمدردی کا جذبہ اور درویشی کی صفت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ درد کی شخصیت کی بلندی اور خوش اخلاقی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس زمانے کے جتنے بھی تذکرہ لکھنے والے ہیں سب نے درد کا ذکر بڑے خوبصورت اور مثبت انداز میں کیا ہے۔ سارے تذکرہ نگاروں کی گردن درد کی بزرگی کی وجہ سے جھکی رہی اور ان لوگوں نے درد کی برائی کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ میر تقی میر نے اپنی شہرہ آفاق کتاب نکات الشعراء میں درد کی شخصیت کا خاکہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> ''وہ (درد) بزرگ ہیں اور بزرگ کے بیٹے ہیں جوان صالح ہیں۔ درویشی میں انھیں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ مجھ فقیر کو ان کا خاص قرب اور عقیدت حال ہے۔ ویسے ان کا حسن سلوک ہر ایک کے لیے عام ہے۔ انھوں نے دنیاوی عزت کی خواہش کو دل سے نکال دیا ہے۔'' (خواجہ میر درد، ظہیر احمد صدیقی صفحہ 19)

میر حسن نے اپنے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں انہیں عالم خوش دل، درویش، نکو صفات، اور آسمان سخن کا آفتاب کہا ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی جو ''اس زمانے کے مشہور شاعر اور تذکرہ نگار ہیں، اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ''سبھی عجیب وغریب فنون کے ماہر، فقر، توکل اور بے نیازی میں بے مثال ہیں۔''

خواجہ میر درد اپنے اصولوں کے سخت پابند تھے اور اس کی خاطر بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور نہ ہی ان سے مرعوب ہوتے تھے۔ ان کی محفل میں امیر اور غریب کی کوئی تخصیص نہیں تھی اور دونوں کے لیے ان کا سلوک یکساں تھا۔ وہ ایک خوددار انسان تھے۔ انہوں نے نہ کسی امیر اور وزیر کی خوشامد کی اور نہ ہی کسی دربار سے وابستہ رہے۔ درد ایک سچے اور پکے مسلمان تھے اور خدا کے سوا کسی کے آگے اپنی ضرورت اور احتیاج کے متعلق

سوال کرنے باعثِ عار محسوس کرتے تھے۔ کسی بھی انسان سے مدد مانگنا ان کی خودداری اور عزت کے خلاف تھا۔

درد نے ابتدا میں شاہ عالم بادشاہ کی فوج میں ملازمت کی اور سپاہی کا پیشہ اختیار کیا۔ لیکن یہ ملازمت ان کے مزاج کے متغایر تھی اور کچھ عرصے بعد اس نوکری سے دستبردار ہو گئے۔ اور انتیس سال کی عمر میں دنیاداری سے الگ ہو کر درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ دنیاوی شان و شوکت اور جاہ و منصب کا خیال ہمیشہ کے لیے دل سے نکال دیا اور بقیہ زندگی راہ خدا میں اور یادِ خدا میں گزار دی۔ میر درد کی اس درویشانہ وضع اور صوفیانہ مزاج کی تعمیر میں بہ ظاہر جو عوامل کارفرما تھے ان میں سب سے زیادہ مستحکم عنصر خود خواجہ ناصر کی تعلیمات اور ان کے روحانی فیوض تھے۔ شاہ سعد اللہ گلشن اور شاہ زبیر سے بھی درد نے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ ان دونوں میں سعد اللہ گلشن سے درد کو نسبتاً زیادہ مناسب تھی۔ شاہ گلشن کا شعری ذوق اور موسیقی کی طرف ان کا رجحان درد کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھا۔

موسیقی اور راگ کا شغف بھی درد کو بڑی حد تک وارثت میں ملا تھا۔ حالانکہ درد کا میلان طبع غنا اور موسیقی کی طرف تھا اور ان کے والد اور مرشد خواجہ ناصر عندلیب بھی موسیقی کے بڑے دلدادہ تھے۔ اور ان کے روحانی پیشوا شاہ سعد اللہ گلشن فن موسیقی میں کمال کے سبب دہلی میں خسرو ثانی کے لقب سے معروف تھے۔ 'نالۂ عندلیب'' میں جگہ جگہ موسیقی کی اصطلاحوں اور مختلف راگوں کے حوالے' موسیقی پر خواجہ ناصر کی دسترس اور اس علم کی فنی باریکیوں سے ان کی واقفیت کا پتہ دیتے ہیں۔ قاضی جمال حسین درد کی موسیقی سے دلچسپی کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''خواجہ میر درد موسیقی سے اپنی دلچسپی کے متعلق خود کہا کرتے تھے کہ نغمہ و سرود کو میں نہ تو فاسقوں فاجروں کی طرح سنتا ہوں جو مجازی محبوبوں کے تصور میں دیوانے ہوتے ہیں اور کانوں کی لذت پر اکتفا کرتے ہیں اور نہ ہی ان مغلوب الحال صوفیا کی طرح جو چنگ و رباب کی فقط دلکش آوازوں پر سر دھنتے ہیں۔ بلکہ جس طرح اہل علم مختلف طبیعی علوم کو پڑھتے پڑھاتے ہیں اور اس کی باریکیوں کو خوب جانتے ہیں مگر علماء کی طرح دل سے اس پر اعتقاد نہیں رکھتے ہیں۔ اس طرح موسیقی کے ساتھ شغل کرتا ہوں کیونکہ موسیقی ریاضی کی ایک پرمیوہ شاخ ہے اور طرفہ لطف و اثر رکھتی ہے۔''

(خواجہ میر درد صفحہ 37)

خواجہ میر درد کا تعلق خاندانی اور پیروں کے اعتبار سے نقشبندیہ سلسلے سے تھا۔ انھوں نے اپنی کتاب ''نالۂ درد'' میں صاف لکھا ہے کہ ''میں اپنے بزرگوں کے طریقہ کو صحیح سمجھتا ہوں اور موسیقی کو عبادت یا اچھی چیز نہیں خیال کرتا

مگر میں اپنے شوق سے مجبور ہوں اور اس کو اللہ کی جانب سے سمجھتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں کبھی گانے والوں کو بلاتا نہیں وہ لوگ خود آتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے گاتے ہیں۔''

اس سے انداز ہوتا ہے کہ انھیں موسیقی سے کس قدر دلچسپی تھی کہ اسے مذہباً اچھا نہ سمجھتے ہوئے بھی اس کے دلدادہ تھے۔ ان کو صرف موسیقی سننے کا ہی شوق نہیں تھا بلکہ وہ خود بھی اس کے ماہر تھے اور بڑے بڑے موسیقار اور استادانِ موسیقی ان کے پاس اس لیے فن کا اظہار کرنے آتے تھے تا کہ ان کے مشورے سے اپنی غلطیاں درست کرلیں۔ ان کے یہاں ہر مہینہ سماع کی محفلیں سجتی تھیں۔ محرم میں سوز خوانی اور مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. میر درد کے والد کا کیا نام تھا؟
2. درد نے کن دو استادوں سے فارسی کا درس حاصل کیا؟
3. درد کا تعلق کس سلسلے سے تھا؟
4. نکات الشعرا کس کی تصنیف ہے۔

2.4 میر دردؔ کی شاعرانہ خصوصیات

درد ایک مشہور صوفی شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ خواجہ میر درد نہ صرف غزل کی روایت سے واقف تھے بلکہ اس روایت کا پورا احترام کرتے تھے۔ درد کا زیادہ تر کلام غزل کی شکل میں ملتا ہے جس میں تصوف کی گہری چھاپ صاف ستھرے الفاظ میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے اشعار ان کے نام ہی کی طرح پر درد اور پر اثر ہیں۔ ان کی زبان رواں اور لچکدار ہے جس میں دہلی کی بول چال کی مٹھاس بھی پائی جاتی ہے ہمیں یہ زبان میر تقی میر کے بعد خواجہ میر درد کے یہاں ملتی ہے۔ جس طرح درد کی زندگی سادہ تھی اسی طرح ان کی شاعری میں بھی کسی قسم کی بناوٹ اور تکلف نہیں پایا جاتا ہے۔ خواہ وہ عشقیہ خیالات ہوں یا اخلاق اور تصوف کے مضامین۔ درد کی شاعری از ابتدا تا انتہا ایک ہی طرح کی سیدھی سادی اور دل میں اتر جانے والی شاعری ہے۔ کہیں الفاظ میں جھول نہیں پایا جاتا۔ وہ شعر اسی وقت کہتے تھے جب ان کے پاس کہنے کے لیے کوئی بات ہوتی تھی۔ ان کا دیوان مختصر ضرور ہے لیکن اس میں بھرتی کے اشعار نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں سادگی کی وجہ ان کا درویشانہ اور فقیرانہ مزاج ہے۔ ایک درویش کو کسی کی تعریف یا برائی کی فکر نہیں ہوتی ہے۔ وہ ریاکاری اور دکھاوے سے بے نیاز رہتا ہے۔ درد کے یہاں کسی قسم کا تکلف اور بناوٹ

دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ یہی بے تکلفی ان کی شاعری کی اہم خوبی تصور کی جاتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے۔

جگ میں آکر ادھر اودھر دیکھا — تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
جان سے ہوگئے بدن خالی — جس طرف تو نے آنکھ بھر دیکھا
ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے
اذیت ' مصیبت ' ملامت ' بلائیں — تیرے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

ان اشعار میں اتنی سلاست اور روانی موجود ہے کہ ایک معمولی اردو جاننے والا انسان بھی اس سے محظوظ ہوسکتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ درد کی شاعری متصوفانہ رنگ سے لبریز ہے اور تصوف کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان کو عشق حقیقی کی بدولت ہر طرف خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے درد کہتے ہیں کہ دنیا میں جدھر بھی دیکھتا ہوں تیرا ہی جلوہ ہر شے میں نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں کس قدر دلکشی اور غنائیت ہے' اس کا اندازہ آپ کو ان اشعار کے پڑھنے کے بعد بخوبی ہوگیا ہوگا۔ اب ان کے اشعار کی روانی اور سادگی ملاحظہ فرمایئے۔

تو بن کہے گھر سے کل گیا تھا — اپنا بھی تو جی نکل گیا تھا
اب دل کو سنبھالنا ہے مشکل — اگلے دنوں کچھ سنبھل گیا تھا
میں سامنے سے جو مسکرایا — ہونٹ اس کا بھی درد دہل گیا تھا
نالۂ ' فریاد آہ اور زاری — آپ سے ہو سکا جو کر دیکھا
ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سون طرح سے مر دیکھا
ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے — تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے
وحدت میں تیری حرف دوئی نہ آسکے — آئینہ کیا مجال تجھے منہ دکھا سکے

قاضی جمال حسین درد کی شاعری' علم و فضل اور شخصیت کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو شاعری کی تاریخ میں درد کا نام ان کی غیر معمولی اور تخلیقی صلاحیت کے سبب نہایت ادب و احترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کے معاصرین اور بعد کے لوگوں نے بھی ان کے علم و فضل روحانی کمالات اور پرکشش شخصیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا

ہے۔اردو فارسی اشعار کے علاوہ سیر وسلوک سے متعلق ان کی متعدد تصانیف' تصوف کے نہایت لطیف اور دقیق مسائل پر خواجہ میر درد کی کامل دست گاہ کا اشاریہ ہیں۔ ایک طویل مدت تک ان کی قیام گاہ دہلی کے خواص اور عوام سبھی کے لیے سرچشمۂ فیضان رہی۔ بڑے بڑے موسیقار' ادیب شاعر اور روحانی ترقیات کے جویا سبھی نہایت ارادت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حسب توفیق واستعداد کسب فیض کرتے۔اردو شعراء میں درد کا امتیاز یہ ہے کہ ان کا ایک منضبط فکری نظام ہے جو ان کی شاعری اور نثری تحریروں کو ایک وحدت عطا کرتا ہے۔صوفیانہ تجربات کو تخلیقی اظہار کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنا اور پھر غزل کی مخصوص روایت اور رسومیات کا پاس ولحاظ رکھنا درد کا اہم کارنامہ ہے۔ (خواجہ میر درد صفحہ 125)

درد کے کلام کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے گی کہ ان کی شاعری میں کوئی بھی بات اخلاق کے معیار کے منافی نظر نہیں آتا اور نہ ہی کوئی چیز خلاف تہذیب نظر آتی ہے۔درد کے محبت کا معیار بہت اونچا اور پاکیزہ ہے۔ہم اگر صوفیانہ کلام اور صوفی شعراء کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ جن شعرا نے اللہ کی محبت کو اپنے دل میں بسالیا تھا' ان کے اشعار میں بھی ایک درد' اثر' پاکیزگی اور بلندی پائی جاتی ہے۔یہی بات ہمیں درد کے یہاں بھی نظر آتی ہے۔وہ اپنے محبوب کی بڑی عزت کرتے ہیں اور اس سے مخاطب ہونے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔اسی لیے ان کے کلام میں بے باکی اور شوخی دکھائی نہیں دیتی:

مزاج نازک دل سے اگر مکدر رہو — یہ آئینہ ہم ابھی پاش پاش کرتے ہیں
نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں — جی میں ہے وہی وفا' پر جی وفا کرتا نہیں
نہ ملیں گے اگر کہے گا تو — تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

درد کے نزدیک پروانے کی شمع سے محبت مثالی محبت ہے۔وہ شمع سے محبت کرتا ہے اس لیے اس سے دور نہیں جاتا اور آخر کار اس پر جان نثار کر دیتا ہے۔درد کے نزدیک اصل محبت کا مفہوم یہی ہے اور کمال محبت کی یہی دلیل ہے۔

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے
راہرو رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
شمع کے صدقے تو ہوتے ابھی دیکھا تھا اسے
پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثرِ پروانہ

شاعر کا خیال یہ ہے کہ پروانہ کے اس سفر پر رشک آتا ہے کہ اس نے شمع کی لو پر ایک جست لگائی اور اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ ایسی محبت پر کون قربان نہ ہو جائے۔ لوگوں نے پروانہ کو شمع پر قربان ہوتے ہوئے تو دیکھا مگر اس کے بعد اس کی خاک کا نشان تک نہ ملا۔ یعنی پروانے نے کس طرح اپنے وجود کو فنا کر دیا اور آناً فاناً خود کو شمع پر قربان کر دیا۔

محبت میں انسان کی کیا حالت ہوتی ہے اس کا اندازہ اگر لگانا ہو تو درد کا یہ شعر دیکھیے جس میں درد نے محبت کی بنیادی شرط کی تشریح کی ہے اور درد کی تصویر کشی درد نے کس انداز سے کی ہے اس کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کبھی ہنسنا ' کبھو رونا ' کبھی حیران ہو رہنا
محبت کیا بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے

میر درد کے یہاں ہمیں زبان و بیان کی چاشنی بھرپور ملتی ہے اور الفاظ کے انتخاب میں وہ نہایت احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں ندرت بیان اور جدت طبع کی دلکشی ملتی ہے۔ وہ عام سی بات کو اس طرح ادا کر دیتے ہیں کہ بے اختیار قاری کے زبان سے داد و تحسین کے کلمات نکل جاتے ہیں۔ مثلاً درد اپنے ایک شعر میں کہتے ہیں کہ اگر چہ ہم سیہ کار اور گناہ گار ہیں مگر پھر بھی ہمارا درجہ اتنا بلند ہے کہ فرشتوں کو بھی ہماری بزرگی اور ہماری منزلت پر رشک پیدا ہوتا ہے۔

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

زاہد اپنی عبادت اور زہد و تقویٰ پر غرور ہوتا ہے اور وہ اپنے سے بہتر اور خدا رسیدہ کسی انسان کو بھی تصور نہیں کرتا ہے۔ درد ان زاہدوں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ انسان کے گناہ کو حقیر مت خیال کرو۔ اگر حضرت آدم جنت میں شجر ممنوعہ (گندم) کے پاس نہ جاتے تو انھیں دنیا میں نہ بھیجا جاتا۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ آتے تو انسانوں کا سلسلہ جاری نہ ہوتا اور نہ تمھیں عبادت کا موقع نصیب ہوتا۔ گویا تمہاری عبادت حضرت آدم کے گناہ کی احسان مند ہے۔ کتنا گہرا فلسفہ درد نے پیش کیا۔ دیکھیے اس فلسفے کو درد نے کتنی سادگی سے اپنے ایک شعر میں پرویا ہے۔

مت عبادت پہ پھولیو زاہد سب طفیل گناہِ آدم ہے

اپنے مطالعے کی جانچ:

5. درد کا زیادہ تر کلام کس شکل میں ہے؟
6. تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا اس مصرع کو مکمل کیجیے۔

7. تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو — یہاں تر دامنی سے کیا مراد ہے؟

2.5 میر درد کی غزل (1)

ارض و سما کہاں تیری وسعت کو پا سکے — میرا ہی دل ہے وہ' کہ جہاں تو سما سکے
میں وہ فتادہ وہوں کہ بغیر از فنا مجھے — نقش قدم کی طرح نہ کوئی اٹھا سکے
قاصد ! نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے — اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے
غافل خدا کی یاد پہ مت بھول زینہار — اپنے تئیں بھلا دے' اگر تو بھلا سکے
یارب! یہ کیا طلسم ہے؟ ادراک وفہم یاں — دوڑے ہزار' آپ سے باہر نہ جا سکے
اطفائے رازِ عشق نہ ہو آب اشک سے — یہ آگ وہ نہیں' جسے پانی بجھا سکے
مست شرابِ عشق وہ بے خود ہے جس کو حشر — اے درد! چاہے لائے بخود' پھر نہ لا سکے

2.5.1 مجموعی تاثر

غزل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ پوری غزل تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ چونکہ درد کی شاعری میں تصوف کے عناصر بھرپور انداز میں ملتے ہیں۔ چنانچہ یہ غزل بھی تصوف ومعرفت اور عشق حقیقی کی پوری تصویر پیش کرتی ہے۔ یہ غزل درد کی بہت معروف ومقبول غزل ہے۔ اس غزل میں درد نے ایک ایسا فلسفہ پیش کیا ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں بھی موجود ہے۔ درد نے اللہ کی شان اور بندے کی بزرگی کا بیان اس غزل میں کیا ہے اور اپنی جذباتی اور احساساتی انداز کو بخوبی اس غزل میں سمویا ہے۔ وہ خدا سے بھی مخاطب ہیں اور کہتے ہیں کہ تیری وسعت تک پہنچنا نہ آسمان کے بس میں ہے اور نہ زمین کے پاس اتنی استعداد ہے کہ تجھے اپنے اندر سمو سکے۔ یہ تو انسان کی بزرگی اور وسعت قلبی ہے کہ اس نے تجھے اپنے اندر بسایا ہے اور تیری عظمت کو تسلیم کیا ہے۔

2.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: اس غزل کے پہلے شعر میں درد نے انسان کی عظمت وبزرگی کو بیان کیا ہے اور خدا کی شان کبریائی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ درد کا یہ شعر قرآن کریم کی ایک آیت کی تفسیر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ میں نے اپنی امانتیں آسمان اور زمین کو پیش کیں لیکن ارض وسما نے اسے قبول نہیں کیا کیونکہ زمین وآسمان کے پاس اتنی وسعت اور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ میری امانتیں قبول کریں اور اس کی وسعت کو محسوس کریں تو میں نے اپنی امانتیں حضرت

انسان کے حوالے کردیں۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے درد نے لکھا ہے کہ زمین اور آسمان کے پاس اتنی استعداد ہی کہاں ہے کہ وہ تیری وسعت کو پاسکیں یا تجھے پہچان سکیں۔یہ صلاحیت تو انسان کے پاس ہے کہ جس نے تجھے (خدا کو) پہچانا۔تیری عظمت کو تسلیم کیا اور تجھے اپنے اندر جذب کرلیا۔اس لیے درد کہتے ہیں کہ یہ میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سما سکے۔یہ حضرت انسان کی شرف و بزرگی کی ایک بڑی علامت ہے۔

دوسرا شعر: دوسرے شعر میں درد کہتے ہیں کہ میں وہ ہستی ہوں کہ جب تک اس دنیا میں ہوں اپنے وجود کا احساس دلاتا رہوں گا اور جب تک میں فنا نہ ہو جاؤں اس وقت تک میں یوں ہی زمین کا ایک حصہ بنا رہوں گا۔میں قدموں کے نقوش کی طرح نہیں ہوں کہ کوئی بھی آئے اور اپنے قدموں کے نقش سے میری ہستی کو مٹا ڈالے۔میں ایک ایسا حیوان ناطق ہوں کہ اپنی پوری زندگی اس دنیا میں گذاردوں گا مگر میرے وجود کو کوئی ہلا نہ سکے گا تاوقتیکہ میری موت نہ آجائے۔اس شعر میں شاعر نے انسان کی عظمت کا ذکر کیا ہے جو پوری زندگی انمٹ نقوش کی طرح اپنے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے اور اسے کوئی دوسرا انسان اس کے وجود کو مٹا نہیں سکتا ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر قاصد سے مخاطب ہے۔آپ جانتے ہیں کہ قاصد پیغام پہنچانے والے کو کہتے ہیں اور وہ پیغام لاتا بھی ہے یعنی دونوں طرف کی پیغام رسانی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ اے قاصد اب تو ہمارے کام نہیں آسکتا ہے۔اس لیے تو میرے پاس سے چلا جا یہاں تیری کوئی کام نہیں ہے کیونکہ میں ایسی جگہ سے پیام منگوانا چاہتا ہوں جہاں تک تمہاری رسائی ممکن ہی نہیں ہے۔اس لیے تم اپنی راہ اختیار کرو۔وہاں صرف میرا دل ہی تھا قاصد بن کر جاسکتا ہے اور اس کا پیام لاسکتا ہے۔شاعر خدا کی ذات کی طرف اشارہ کررہا ہے اور اپنی مخصوص ادا کے اظہار کے ذریعے عشق و معرفت کے اصول بیان کررہا ہے۔یہ پورا شعر معرفت کے اسرار و رموز سے پر ہے جس میں عشق حقیقی کی پوری تصویر نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر میں شاعر انسان کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے کہ اے انسان تو ہرگز اپنے دل سے خدا کی یاد ہرگز ہرگز مت جانے دے اور ہر وقت اس کی یاد میں مصروف رہ۔اور اس کی یاد میں اگر تم خود کو بھول جاؤ تو تم خود کو بھلا دو۔اگر تم خود کو خدا کی یاد میں بھلا دو گے کہ تو تم خدا کی معرفت کو پاسکو گے اور یہی اس کی پہچان' وہاں تک پہنچنے کا ذریعہ ہے کہ اس کی یاد میں اتنے مصروف ہو جاؤ کہ تم خود سے بھی غافل ہو جاؤ۔شاعر نے یہاں تصوف کی اس منزل کی طرف اشارہ کیا ہے جو خدا کی معرفت کی اولین شرط ہے۔

پانچواں شعر: خود انسان جتنی بھی کوشش کرے مگر وہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔جہاں تک وہ پہنچنا چاہتا

ہے جب تک خدا کی مرضی اس میں شامل نہ ہو۔اس شعر میں خدا سے مخاطب ہو کر شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! یہ کیسا طلسم ہے یعنی یہ کیسا جادو کا تماشہ ہے کہ انسان کی عقل وفہم چاہے جتنی بھی کوشش کر لے اور جتنی بھی سمجھ بوجھ سے کام لے مگر وہ اس جگہ خود کو مجبور اور لاچار پاتا ہے اور وہ اپنی ذات کے حدود سے باہر نہیں نکل پاتا ہے۔یعنی انسان اپنی عقل وفہم کی رفتار کی پوری صلاحیت صرف کیوں نہ کر دے اور اپنی ذات سے قطعی طور پر الگ نہیں ہوسکتا۔یعنی وہ اپنے آپ کو پہچاننے میں ہی پوری زندگی صرف کر دیتا ہے۔

چھٹا شعر: اس شعر میں شاعر نے عشق مجازی سے عشق حقیقی کی صفت کو الگ کر کے پیش کیا ہے۔اور عام کلیہ یہ ہے کہ جب آگ لگتی ہے تو پانی سے اسے بجھایا جاتا ہے لیکن اس شعر میں اس فلسفے کو بیان کیا گیا ہے کہ اگر عشق کے راز کی آگ جب شعلہ زن ہوتی ہے تو اس آگ کو آنسوؤں سے نہیں بجھایا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس پانی سے یہ آگ بجھ سکتی ہے جسے عام طور پر لوگ آگ لگنے کے بعد استعمال کرتے ہیں۔یہ آگ اندرونی اور دلی جذبات واحساسات اور عشق حقیقی کی آگ ہے۔یہ اس وقت تک نہیں بجھے گی جب تک حقیقی محبوب (خدا) تک رسائی نہ ہو جائے اور جب اس تک رسائی ہو جائے گی یہ آگ خود بخود بجھ جائے گی۔اس شعر میں شاعر نے معرفت کی بہت خوبصورت ترجمانی کی ہے۔اور عشق حقیقی اور عشق مجازی کی درمیان ایک خطِ فاصل کھینچ کر دونوں میں فرق پیدا کر کے عشقِ حقیقی کی برتری اور عظمت کو بیان کیا ہے۔

ساتواں شعر: شراب پینے کے بعد شرابی کی کیا کیفیت ہے۔اسی کیفیت کا اظہار اس شعر میں کیا گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق کا شراب پی کر شرابی اس قدر مبہوت اور بے خود ہو جاتا ہے کہ وہ حشر کے میدان میں پہنچنے تک اسی شراب کے نشے میں رہتا ہے اور خود کو بھول کر صرف ایک ہی چیز اس کے حافظے میں محفوظ رہتی ہے اور وہ ہے عشق حقیقی کا متبع یعنی وہ جس ذات واحد سے عشق کرتا ہے اس کے سامنے صرف اسی کی تصویر حشر برپا ہونے تک قائم رہتی ہے اور اگر اسے حشر کے میدان میں اس عشق کے متوالے کو بیدار کیا جائے تو بھی وہ بیدار نہ ہوسکتا ہے۔شاعر نے حشر کے میدان کی طرف اشارہ کر کے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ حشر کے میدان میں جہاں نفسی نفسی کا عالم ہوتا ہے۔چاروں طرف شور وغوغا ہوتا ہے اور اس شور کو سن کر بھی وہ شرابی اپنے نشے سے ہوش میں نہیں آتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عشقِ حقیقی میں مبتلا انسان ایسی شراب پیتا ہے جس کے پینے کے بعد پوری زندگی اسی نشے میں رہتا ہے اور اس کے سامنے چاہے حشر کا میدان ہی کیوں نہ برپا ہو وہ اسی نشے سے الگ نہیں ہوتا اور ہوش میں نہیں آتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

8. اس غزل کے پہلے شعر میں شاعر نے کون سا فلسفہ پیش کیا ہے؟

9. اطفائے رازِ عشق سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟

10. تیسرے شعر میں کس قاصد کی خصوصیت بیان کی گئی ہے۔

3.6 میر درد کی غزل (2)

تہمت چند اپنے ذمے دھر چلے — جس لیے ہم آئے تھے، سو کر چلے

زندگی ہے، یا کوئی طوفان ہے؟ — ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا! — ایک دم آئے ادھر، اودھر چلے

شمع کی مانند ہم اس بزم میں — چشم تر آئے تھے، دامن تر چلے

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

دردؔ! کچھ معلوم ہے؟ یہ لوگ سب — کس طرف سے آئے تھے، کدھر چلے

3.6.1 مجموعی تاثر

اس غزل میں شاعر نے زندگی کا فلسفہ اور اس کا مقصد پیش کیا ہے۔ انسان اس دنیا میں ایک معینہ وقت تک کے لیے آتا ہے اور اس معینہ زندگی میں مختلف طرح کے کام کر کے چلا جاتا ہے یعنی وہ فوت ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ گناہوں کا بوجھ لے کر جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس پر تہمت لگاتے ہیں اور کچھ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں ایک پروانے کی طرح امید لے کر آتا ہے اور اس کے دل میں امیدوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں مگر وہ جب جاتا ہے تو اس کی پلکیں بھیگی ہوتی ہیں۔ وہ دنیا سے جدا ہونے کے غم میں آہ وزاری کرتا ہوا دارِ بقا کی طرف کوچ کر جاتا ہے۔ دنیا میں جتنے لوگ بھی آتے ہیں ان میں سے کسی کو یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس لیے آئے تھے کہاں سے آئے تھے اور کس طرف چلے جاتے ہیں؟ زندگی کا یہی فلسفہ اس غزل میں پیش کیا گیا ہے۔

3.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: دنیا میں آنے کا مقصد اس شعر میں بیان کیا گیا ہے۔ اس شعر میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب انسان دنیا میں آتا ہے تو اپنی پوری زندگی اچھے اور برے کاموں کی انجام دہی میں گزار دیتا ہے اور جب وہ مر جاتا ہے تو اس کی

موت کے بعد اس کے اچھے اور برے کارنامے ہی یاد کیے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اس پر تہمت لگاتے ہیں اور بہتان تراشی کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم جس لیے آئے تھے وہ کر چکے اور اپنے ذمے تہمت کا داغ لے کر جا رہے ہیں۔ یعنی اب ہم اس دنیا سے رخصت تو ہو رہے ہیں لیکن بڑے افسوس کے ساتھ جا رہے ہیں اور اس افسوس کے ساتھ بھی جا رہے ہیں کہ کاش تھوڑی عمر اور مل جاتی تو اچھے کام کر لیتے مگر ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مرنے والا دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسی افسوس کے ساتھ رخصت ہو رہا ہے۔ شاعر کا اشارہ اسی جانب ہے اور وہ یہ بھی بتانا چاہتا ہے کہ وہ گناہوں کا بوجھ اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہے۔

دوسرا شعر: اس شعر میں زندگی کو طوفان سے تشبیہ دی گئی ہے یعنی طوفان میں جس طرح کی بلا خیزی اتار چڑھاؤ، نشیب و فراز ہوتی ہے ٹھیک زندگی بھی اسی طوفان کے مانند ہے۔ ہم نے زندگی میں اتنے اتار چڑھاؤ، مصائب، دکھ درد اور آفتیں برداشت کی ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ زندگی نہیں ہے بلکہ مصیبتوں کا طوفان ہے اور اس طوفان سے ہم اس قدر نبرد آزما ہوتے رہے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم زندہ نہیں ہیں بلکہ مر چکے ہیں۔ یعنی ہم نے زندگی میں اتنی مصیبتیں برداشت کی ہیں کہ اس زندگی میں ہمیں موت نظر آنے لگی ہے۔ صنعت تشبیہ کی خوبصورت مثال اس شعر میں پیش کی گئی ہے۔

تیسرا شعر: اس شعر میں شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ ہم نے زندگی میں بڑی مصیبتیں برداشت کی ہیں اور زندگی کی حقیقت سے آشنائی حاصل کر چکے ہیں۔ ہم کو ان گلوں بھی کی حقیقت معلوم ہے کہ یہ پھول صرف چند لمحوں کے لیے کھلتے ہیں پھر مرجھا جاتے ہیں۔ اس لیے اے بادصبا! ہمیں ان گلوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ان کی تو یہ حالت ہے کہ تھوڑے دیر کے شگفتہ ہوئے اور پھر تھوڑی دیر بعد ان میں پژمردگی آ گئی۔ اس لیے ہم ان پھولوں کے وقتی حسن میں یقین نہیں رکھتے ہیں۔ یہ صرف انسان کو اپنے فریب میں مبتلا کرنے کے لیے کھلتے ہیں اور ہم وقتی حسن پرستی کے قائل نہیں ہیں۔ ہم تو اس حسن کے قائل ہیں جس کا حسن دائمی ہے۔ یعنی خدائے واحد کی جانب اشارہ ہے۔

چوتھا شعر: یہ شعر انسان کی اس کیفیت کو بیان کرتا ہے جس سے وہ اپنے وجود کو ابتداء میں دوچار ہوتا ہے۔ انسان کے بارے میں شاعر کا تصور ہے کہ انسان اس دنیا میں شمع کی طرح صاف روشن اور امید کا سہارا لے کر آیا تھا۔ لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے ساتھ گناہوں کی آلودگی ساتھ ساتھ گئی۔ یعنی وہ جب اس دنیا میں آیا تھا تو نہایت پاک صاف اور معصوم بن کر آیا تھا لیکن جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے ساتھ گناہوں کے انبار تھے۔ یہاں چشم تر سے مراد پاک صاف اور روشن و تابندہ ہے اور دامن تر سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے۔ اس شعر میں شاعر نے اس زندگی کی سچائی بیان کی ہے جو ناقابل انحراف ہے اور جس سے کوئی انکار ہی نہیں کر سکتا ہے۔

پانچواں شعر: اس شعر میں عمر کی اس منزل کا بیان ہے جب انسان اپنی موت کی گھڑیاں گنتا ہے اور چاہتا ہے کہ جو بھی زندگی کا وقت بچا ہے اسے خوشی خوشی گزار دے۔ اس لیے درد کا یہ کہنا ہے کہ اے ساقی! اب تم صرف ساغر پیش کرتے رہو اور میں شراب سے مستی حاصل کرتا رہوں۔ کیونکہ اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میرے چل چلاؤ کا وقت آ گیا ہے اور میری زندگی کے صرف چند ایام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اس قلیل مدت میں شراب کا سہارا لوں اور زندگی کے آخری لمحوں کو خوشی و مسرت میں گزار دوں۔ شراب کے نشے میں مجھے وہ خوشی اور مستی حاصل ہوگی کہ میں پوری دنیا میں بھول جاؤں گا۔ اس لیے اے ساقی! تو اب شراب کا جام پلاتا جا۔ اور میں اس سے مستفید ہوتا رہوں۔ اس شعر میں زندگی کی وہ تلخ حقیقت پوشیدہ ہے جو یقینی اور حتمی ہے۔

چھٹا شعر: دنیا میں آج تک اس معما کو کوئی بھی آدمی حل نہ کر سکا کہ وہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے۔ بڑے بڑے شعرا نے اس فلسفے کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر عمر خیام نیشاپوری نے بھی اس فلسفے کو اپنے رباعی میں پیش کیا ہے کہ دنیا میں جہاں ہم آتے اور چلے جاتے ہیں نہ اس کی ہمیں ابتدا معلوم ہے نہ انتہا کی خبر ہے۔ کوئی بھی شخص اچھی طرح یہ بات نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں چلا جائے گا۔ اسی فلسفے کو درد نے بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اے درد! کیا تمہیں کچھ اس بات کی خبر ہے کہ اس دنیا میں جتنے لوگ آتے ہیں کہاں سے آتے ہیں اور پھر پوری زندگی گزار کر کہاں چلے جاتے ہیں؟ درد نے سوالیہ انداز میں شعر لکھا ہے اور خود سے مخاطب ہو کر دنیا کی ناپائیداری اور انسان کی لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ درد نے سوالیہ انداز میں یہ شعر لکھ کر شعری حسن میں اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی صنعتِ شعری کی خوبی تصور کی جاتی ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ:

11. اس غزل کے پہلے مصرعے میں تہمت چند سے کیا مراد ہے؟
12. زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے؟ اس مصرعے میں کون سی صنعت استعمال کی گئی ہے؟
13. آخری شعر میں زندگی کا کون سا معما پیش کیا گیا ہے؟

3.7 خلاصہ

خواجہ میر درد دہلی میں 1721ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام خواجہ محمد ناصر عندلیب تھا جو اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور صوفی تھے۔ درد نے بنیادی تعلیم اور تصوف کا درس اپنے والد سے ہی حاصل کیا۔ اور شاعری کی

جانب راغب ہوگئے۔ چونکہ ان کے خانوادے میں تصوف ومعرفت کی روایت پہلے سے چلی آ رہی تھی چنانچہ درد بھی اپنے کو معرفت کی وادی میں داخل ہونے سے روک نہ سکے اور شاعری میں تصوف کے اسرار ورموز، علم معرفت کا بیان اور عارف کی حقیقت کا اظہار کرنے لگے۔ درد کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا۔ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے فارسی میں مختلف کتابیں لکھیں۔ انھوں نے اپنے دور کے دو مشہور بزرگ استاد مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزو سے فارسی پڑھی۔ درد ایک خوددار اور خداترس انسان تھے۔ بڑے بڑے شاہان وقت سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔ ان کے دل میں خوفِ خدا، مذہب کی پابندی، بے نیازی، استغنا، ہمدردی اور رحم دلی کا جذبہ موجود تھا۔ درد کے تذکرہ نگاروں میں ایسا کوئی تذکرہ نگار نہیں گزرا ہے جس نے درد کی خوبیاں اور ان کے اوصاف نہ بیان کیے ہوں۔ کسی تذکرہ نگار نے درد کی خامیاں نہیں بیان کی ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے تذکرہ ''نکات الشعراء'' میں درد کو بزرگ اور بزرگ کا بیٹا قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ درویشی میں درد کو بڑا رتبہ حاصل ہے اور انھوں نے دنیاوی عزت کی خواہش کو دل سے نکال دیا ہے۔ درد نے ابتداء میں سپاہی کا پیشہ اختیار کیا۔ مگر مزاج کے خلاف ہونے کے باعث اس پیشے سے جلد ہی الگ ہوگئے۔ درد کا تعلق سلسلہ نقشبندیہ سے تھا۔ انھوں نے ایک کتاب نالۂ درد لکھی جس میں انھوں نے موسیقی میں اپنی دلچسپی کو جائز اس لیے قرار دیا کہ اس میں انھیں سکون ملتا تھا۔ ان کے یہاں ہر ماہ سماع کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ میر کی شاعری ان کی ذات سے عبارت ہے۔ وہ ایک درویش صفت اور صوفی شاعر تھے چنانچہ ان کی پوری شاعری اسی کی عکاسی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں قرآن کا فلسفہ، اخلاقیات، انسانی زندگی کی حقیقت، موت کی تلخ سچائی، عبرت انگیز نصائح، خوفِ خدا اور عشق حقیقی کی منازل کی پوری تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہر انسا کا مرجع صرف خدا کی ذات ہے اور ہر شے میں اسی کا ظہور ہے۔ اس لیے تو کہتے ہیں۔

جگ میں آ کر ادھر اودھر دیکھا　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

درد کی شاعری میں سادگی، سلاست، روانی، موسیقیت اور دیگر شعری خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے اشعار میں دنیاداری میں دلچسپی رکھنے والے انسانوں کے لیے عبرت پوشیدہ ہے۔ وہ عشق حقیقی کی بات کرتے ہیں اور عشق حقیقی کی بات کرنے والا صرف خدا کی ذات کی طرف لو لگانے کی تلقین کرتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ دنیا میں اگر کسی ذات واحد سے دل لگانا ہے تو خدا کی ذات سے دل لگاؤ کیونکہ اس سے دل لگانے میں کوئی رسوائی نہیں ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شے میں خدا کی ذات موجود ہے۔ جب ہر شے میں خدا موجود ہے تو کیوں نہ اس سے محبت کی جائے اور اسی کی یاد میں اپنی زندگی گزار دی جائے۔

ہے غلط گر گمان میں کچھ ہے　　تجھ سوا بھی جہان میں کچھ ہے

درد کی شاعری میں احساسات و جذبات کی بلندی، خیالات کی رفت اور تصوف و معرفت کے فلسفیانہ مسائل ملتے ہیں۔ وہ اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں اور اردو شاعری میں ان کا ایک اہم مقام ہے۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے 10-10 سطروں میں جواب دیجیے۔

(الف) 1. درد کی صوفیانہ شاعری کو مثالوں سے واضح کیجیے۔

2. خواجہ میر درد کی تعلیم اور ملازمت کے متعلق اظہار خیال کیجیے۔

3. خواجہ میر درد کی موسیقی میں دلچسپی کے وجوہات بیان کیجیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے 30-30 سطروں میں جواب دیجیے۔

1. خواجہ میر درد کی حیات پر روشنی ڈالیے۔

2. میر درد کی شاعرانہ خصوصیات مع مثال پیش کیجیے۔

3. خواجہ میر درد کے اہم کارناموں اور ان کے خانوادے کا ذکر مفصل لکھیے۔

4. درد کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی وجوہات بیان کیجیے۔

3.9 فرہنگ

علوم رسمیہ	وہ علوم جو زمانہ قدیم سے چلے آتے ہوں اور رائج ہوں
تصوف	پشمینہ پہننا۔ اصطلاحاً علم معرفت۔ دل کو خدا کی یاد میں ہمہ وقت مصروف رکھنا
سماع	قوالی، سننا، رقص و سرود
توکل	بھروسہ کرنا۔ اپنے کام کو کسی کے حوالے کرنا۔ کسی کو وکیل بنانا
مرعوب	کسی سے ڈر جانا، رعب میں آیا ہوا
نالۂ عندلیب	بلبل کی فریاد
عوامل	عامل کی جمع۔ عمل کرنے والا۔ اثرات

سرود	نغمہ، راگ، ایک قسم کا باجا
چنگ و رباب	ستار کی قسم کا ایک باجا۔ رباب ایک قسم کی سارنگی
دلدادہ	شوقین۔ چاہنے والا
تصنع	بناوٹ۔ دکھاوا
مکدر	گدلا، میلا، ناراض، غمگین
مقدم	پیش کیا گیا، پہلا، سابقہ، قدیم، اعلیٰ، معزز
جست	چھلانگ، پھاند، قلانچ، چوکڑی
داد و تحسین	تعریف کے کلمات، مدح سرائی
تر دامنی	گناہ گاری
ارض و سما	زمین و آسمان
وسعت	گنجائش، کشادگی، پھیلاؤ، چوڑائی
فتادہ	پڑا ہوا، زمین پر قائم
بے خود	آپ سے بے خبر، از خود رفتہ، مدہوش، سرشار
اطفائے راز عشق	عشق کے راز کی آگ بجھانا
استعداد	صلاحیت، لیاقت، قابلیت
شانِ کبریائی	اللہ تعالیٰ کی شان
طلسم	جادو کا تماشہ
شعلہ زن	آگ کا شعلہ نکلنا، شعلہ مارنے والا
مبہوت	حیران، ہکا بکا
نشیب و فراز	اتار چڑھاؤ، اونچ نیچ
صنعت تشبیہ	علم بیان کی ایک قسم جس سے کسی چیز کو تشبیہ دی جائے
انحراف	منہ پھیرنا، دور رہنا، الگ رہنا، پھر جانا، انکار، نافرمانی
معما	پوشیدہ، مبہم، پہیلی، پیچیدہ بات

3.10 معاون کتابیں

1.	خواجہ میر درد	ظہیر احمد صدیقی
2.	خواجہ میر درد	قاضی جمال حسین
3.	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	سید احتشام حسین
4.	تاریخ ادب اردو	جمیل جالبی

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. خواجہ محمد ناصر
2. مفتی دولت اور سراج الدین خاں آرزو سے
3. نقشبندیہ سلسلے سے
4. میر تقی میر کی
5. غزل شکل میں
6. جگ میں آ کر ادھر ادھر دیکھا
7. گناہ گاری۔ سیہ کاری
8. اللہ نے اپنی امانتیں زمین و آسمان کو پیش کیں مگر وہ متحمل نہ ہو سکے اور انسان نے اسے قبول کر لیا۔
9. عشق کے راز کی آگ بجھانا
10. جو عشق حقیقی رکھنے والوں کا قاصد ہوتا ہے
11. تہمت چند سے مراد گناہوں کا بوجھ ہے
12. صنعت تشبیہ
13. اس میں انسان کی لاعلمی بتائی گئی ہے کہ اسے یہ نہیں معلوم کہ وہ دنیا میں کہاں سے آتا ہے پھر کہاں چلا جاتا ہے۔

اکائی 3: سراج اورنگ آبادی

ساخت

3.1 اغراض ومقاصد

3.2 تمہید

3.3 سراج اورنگ آبادی کی حیات

3.4 سراج اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات

3.5 سراج اورنگ آبادی کی غزل (1)

3.5.1 مجموعی تاثر

3.6 سراج اورنگ آبادی کی غزل (2)

3.6.1 مجموعی تاثر

3.6.2 اشعار کی تشریح

3.7 خلاصہ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.9 فرہنگ

3.10 معاون کتابیں

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

3.1 اغراض ومقاصد

اردو شاعری میں ولی دکنی کی شاعری سے ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ولی نے قدیم روایاتِ شاعری سے انحراف کرتے ہوئے نئی طرحِ شاعری کی ایجاد کی۔ ان کے پیروکاروں میں بہت سے شعراء کے نام تاریخی کتب میں ملتے ہیں جن میں سب سے اہم سراج اورنگ آبادی کا نام ہے۔ آپ اس اکائی میں دکنی شاعری کی خصوصیات اور

سراج اورنگ آبادی کے شعری اوصاف کے متعلق پڑھیں گے۔اس اکائی کو پڑھ کر اندازہ لگائیں گے کہ دکنی شاعری شمالی ہند کی شاعری سے کتنی مختلف ہے۔زبان و بیان طرز ادا اور اظہار مطالب کے اعتبار سے دونوں جگہوں کی شاعری کا آپ کو بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔سراج کی حیات کے ان گوشوں کو بھی اجاگر کیا جائے گا جس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ سراج صرف تیرہ سال کی عمر میں ہی تصوف و معرفت کی وادی میں داخل ہو گئے اور ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی۔ساتھ ہی ان کے غزلوں کی تشریح مشکل الفاظ کی فرہنگ اور مختلف سوالات و جوابات بھی پیش کیے جائیں گے جس سے آپ کو سراج کی شخصیت اور ان کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

3.2 تمہید

شمالی ہند کی شاعری اور جنوبی ہند کی شعری جہات میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔لب ولہجہ، زبان و بیان طرز ادا اور موضوعات شعر میں دونوں مقامات کی شاعری ایک دوسرے سے مختلف نظر آتی ہے۔جہاں ہم شمالی ہند کی شاعری میں میر تقی میر، میر درد، غالب اور اقبال کی شاعری کو پڑھتے ہیں تو ہمیں زبان کے لہجے کے اعتبار سے اور لسانی نقطہ نظر سے ایک مخصوص نظریے کا احساس ہوتا ہے تو دوسری جانب جنوبی ہند کی شاعری میں ولی، نصرتی، رستمی، ہاشمی، جنیدی، قاضی محمود بحری اور سراج اورنگ آبادی کا لب ولہجہ اور زبان و بیان ایک دم الگ تھلگ نظر آتا ہے۔یہاں ہم اسی دکنی شاعری کے ایک اہم شاعر سراج اورنگ آبادی کے بارے میں مطالعہ کریں گے جن کی شاعری میں سلاست، روانی پائی جاتی ہے۔تصوف و معرفت کے رموز ان کی شاعری کے اہم اوصاف ہیں۔ہم ان تمام نکات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جنھیں سراج نے اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔آیئے ہم دیکھیں کہ سراج کی حیات اور ان کی خدمات کیا تھیں؟

3.3 سراج اورنگ آبادی: حیات

سید سراج الدین نام اور تخلص سراج تھا۔سراج اورنگ آبادی کے نام سے شہرت پائی۔سراج کی پیدائش اورنگ آباد میں 1714ء میں ہوئی۔آپ سادات حسینی خاندانِ مشائخ سے تھے۔اورنگ آباد ہی میں آپ کی تعلیم و تربیت ہوئی۔سراج بارہ سال کی عمر تک تحصیل علم میں مشغول رہے۔بعد ازاں آپ پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی۔کبھی وہ صحرا نوردی کرتے اور کبھی حضرت برہان الدین غریب کے مزار پر جا بیٹھتے۔ان کے والدان کی وحشت کم کرنے کی غرض سے انھیں گھر لے آتے اور ان کے پاؤں میں زنجیر پہنا دیتے تا کہ وہ گھر سے باہر نہ نکل سکیں۔اسی

جذب کی کیفیت کو سراج نے منتخب دواوین کے دیباچے میں لکھا ہے۔ وہ اپنا حال اس انداز میں لکھتے ہیں:

''یہ فقیر بارہ برس کی عمر میں جوش و جذبہ و غلبۂ شوق سے سات برس تک برہنہ تن و برہنہ سر رہا۔ اکثر اوقات عالم بے خودی میں حضرت شاہ برہان الدین غریب دولت آبادی کے روضہ کے اطراف میں گھومتا تھا۔ اسی حالت مستی میں اکثر اشعار فارسی زبان سے برآمد ہوتے۔ مگر تحریر کے دائرے میں نہیں آتے اور اگر وہ تمام اشعار موجود ہوتے تو ایک ضخیم و بزرگ دیوان مرتب ہو جاتا۔ پھر مدتِ مذکورہ کے بعد حضرت خواجہ سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی المتوفی 1611ء کی خدمت میں پہنچا۔ حسنِ ارادت سے مرید ہوا۔ ان دونوں میں بیاسی خاطر عزیزی عبدالرسول خاں جو فقیر کے برادر طریقت تھے۔ اکثر اشعار ریختہ زبان میں لکھے گئے۔ خاں صاحب نے جواہر متفرق کو جو تخمیناً پانچ ہزار اشعار تھے۔ حروفِ تہجی میں ترتیب دیا اور کامل دیوان شائقین کی خدمت میں بھیجا۔ پھر فقیری اختیار کی اور مرشد کے حکم سے شعر گوئی ترک کی۔'' (تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ۔ صفحہ 51)

اس اقتباس سے اندازہ ہو گیا کہ سراج صرف 12 سال تک تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بعد ازاں سلوک و معرفت کی وادی میں داخل ہوئے۔ شعر گوئی شروع کی اور سات سال تک وہ اسی جذب و کیف کی حالت میں رہے۔ جب ان کی طبیعت میں قدرے سکون ہوا تو 1733ء میں شاہ عبدالرحمٰن چشتی سے ہم کلام ہوئے۔ اردو میں شعر کہے اور چوبیس سال کی عمر میں 1755ء میں دیوان مکمل کیا۔ مرشد نے شعر گوئی سے منع کیا تو فارسی شعرا کے دواوین کا مطالعہ کیا اور پسندیدہ غزلوں کا انتخاب ''منتخب دیوانہا'' 1739ء میں مرتب کیا۔ سراج نے تمام اصنافِ سخن میں شعر کہے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' 1747ء میں لکھی گئی جو ایک دردانگیز آپ بیتی ہے۔ یہی درد اور تاثر سراج کے پورے کلام میں موجود ہے جس سے سراج کو ولی دکنی، محمود بحری کے بعد تیسرا بڑا شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ سراج اورنگ آبادی نے پانچ سات سال کے اندر اندر تمام مشہور اساتذۂ فارسی کا کلام پڑھ لیا تھا انھیں فارسی ادب اور خصوصاً شاعری سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ چنانچہ بارہویں سال سے جب ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوئی تو اضطراری طور پر فارسی اشعار ان کی زبان سے جاری ہونے لگے۔ اس عرصہ میں سراج کی طبیعت کے پوشیدہ جوہر ظاہر ہونے لگے۔ یہ وقت ان کی شاعری کی ابتدا کا دور تھا۔ جب فارسی اشعار بے اختیاری طور پر ان کی زبان پر جاری ہو جاتے

تھے۔ اگر ان کے تمام کلام جمع ہو گئے ہوتے تو فارسی گو شعراء میں سراج کو نمایاں مقام حاصل ہوتا۔ ابھی تک جو بھی ان کے فارسی کلام ملے ہیں وہ ادھورے ہیں اور جستہ جستہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے ان کی فارسی شاعری پر صحیح رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

سراج نے 1734ء میں حضرت شاہ عبدالرحمٰن سے بیعت کی اور یہی زمانہ ان کی اردو شاعری کے آغاز اور عروج کا ہے۔ اور غالب گمان یہ ہے کہ وہ اپنے شعر کی تاثیر کو اپنے مرشد عبدالرحمٰن کے فیض روحانی کا اثر تصور کرتے۔ یہ شعر ان کی اس فیض رسانی کی دلیل ہے۔

مشعلِ سوزِ جگر ہے ہر غزل میری سراجؔ
شمع روشن ہے فیض شاہ رحماں کے طفیل

سراج اورنگ آبادی جب حضرت شاہ عبدالرحمٰن کی سلسلہ ارادت میں داخل ہوئے تو ان کی عمر اس وقت صرف بیس سال تھی وہ ابھی لاابالی انداز کی زندگی گزارتے تھے۔ سراج جب اپنے مرشد کی خدمت سے الگ ہوتے تو ان کا زیادہ تر وقت شعر و شاعری میں گزرتا۔ ان کے گھر پر ان کے احباب اور دوستوں کا ہجوم رہتا تھا۔ حالانکہ سراج کے گھر والوں کو یہ بات پسند نہیں تھی کہ ان کے گھر پر ہمیشہ لوگوں کا مجمع لگا رہے۔ لیکن سراج کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ ان کی طبیعت کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جا سکتا ہے۔

معتبر نہیں جمال ظاہر کا
گردش روزگار کی سوگند
جو دل کا آئینہ ہو صاف رنگ غفلت سیں
کوئی دوسرا نظر نہیں آیا مثالِ دوست

ڈاکٹر جمیل جالبی نے سراج اورنگ آبادی کی حیات، خدمات اور شاعری کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے دل میں جذب و کیف کی وہ بے خودی شامل تھی جس نے محویت کا سرور ان کے دل میں ڈال دیا تھا وہ عشق حقیقی میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ دنیا کی ہر شے سے لاتعلقی ان کی شخصیت کا ایک حصہ بن چکی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''سراج کے کلام سے یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ یہ ''آواز'' اردو شاعری میں پہلی بار سنی جا رہی ہے۔ اس میں ایک ایسی خود سپردگی اور ایک ایسی سرشاری ہے جو اب تک کسی شاعر کے یہاں اس طرح سمٹ کر، جم کر سامنے نہیں آئی

تھی ۔ سراج کی شخصیت کی تعمیر میں جن عناصر نے حصہ لیا تھا ان میں عالم جذب و کیف سے پیدا ہونے والی ''محویت'' نے بنیادی رنگ بھرا تھا۔ عشق کے غلبے نے نشۂ بے خودی کو جنم دیا تھا۔ فارسی زبان و ادب کے گہرے شغف نے اظہار کے وسیلوں کو بہتر و موثر بنانے میں مدد دی تھی ۔ ذہانت کا یہ عالم کہ بہت کم عمری میں ہی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور جب بارہ سال کے ہوئے تو سرشاری عشق نے جنون کی کیفیت اختیار کر لی اور سراج اسی کیفیت میں صحرانورد ہو گئے ۔ دن رات گھومتے اور شاہ برہان الدین غریب کے مزار پر منزل کرتے ۔ اسی عالم بے خودی میں فارسی اشعار منہ سے بے ساختہ جاری ہوتے ۔'' (تاریخ ادب اردو ۔ جلد اول صفحہ 566)

سراج کی اردو شاعری کی ابتدا اور عروج کا یہ وہ زمانہ تھا جب عبدالرسول خاں سے ان کی دوستی بڑھی ۔ بچپن سے ان کی دوستی کے جو نقش ان کے دل پر مرتب ہوئے تھے ۔ اب بہت گہرے ہو گئے تھے ۔ سراج کے دوسرے دوستوں میں شاہ ضیاء الدین پروانہ، شاہ تاج الدین، شاہ چراغ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ ضیاء الدین کو جو محبت سراج سے تھی، وہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے جو سراج کی رعایت سے اختیار کیا گیا تھا ۔ ان کے نام سراجؔ نے جو خطوط لکھے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سراج ان سے کس درجہ بے تکلفی اور محبت سے پیش آتے تھے ۔ ضیاء الدین نے بھی سراج کی بڑی خدمت کی ۔ لیکن سراج کو جو محبت عبدالرسول خاں سے تھی، وہ ان میں سے کسی اور سے نہیں تھی ۔ انھیں کے اصرار کرنے پر سراج اپنا اردو کلام زیور تحریر سے آراستہ کرنے پر مجبور ہوئے اور عبدالرسول خاں نے ان منتشر جواہر پاروں کو ردیف وار ترتیب دے کر سراج کا کلام مرتب کیا۔

سراج کے کلام میں بعض جگہ عبدالرسول خاں کے اشارے بھی پائے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج کو عبدالرسول خاں سے کس قدر محبت تھی اور ان سے کتنی گہری دوستی تھی ۔

صبا میرے جواں لشکری کوں جا خبر کرنا
دل بے درد میں اس یار کے جا کر اثر کرنا

عبدالرسول خاں آخری زمانے میں لشکر میں شریک ہو گئے تھے ۔ سراج کے خطوط سے اس جانب اشارہ ملتا ہے ۔ انھیں کی وجہ سے سراج کبھی کبھی لشکر میں رہا کرتے تھے ۔ اس مختصر مدت میں سراج کی شاعری بہت عروج کو پہنچی جس سے سراج کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ ان کی شہرت بھی اسی قلیل مدت میں ہوئی جو دیگر شعراء کو کئی سالوں میں

ملتی ہے۔ یہ سراج کی ذہانت اور قابلیت کی دلیل ہے۔ 1156ھ سے پہلے سراج اورنگ آبادی کی شاعری کی شہرت گجرات اور شمالی ہند کے علمی مرکزوں، دہلی وغیرہ تک پہنچ گئی تھی۔ ریختہ میں ولی دکنی کے بعد سب سے بڑے استاد تسلیم کیے گئے اور ولی کے جانشین تصور کیے گئے۔

1161ء میں حضرت شاہ عبدالرحمٰن چشتی کا وصال ہوگیا۔ سراج کو ان سے جو ارادت تھی اس کے مدنظر یہ جانکاہ صدمہ ان کے لیے یقیناً تکلیف دہ تھا۔ وہ پہلے ہی فقر و درویشی اختیار کر چکے تھے۔ اس حادثے کے بعد وہ اور بھی دنیا سے کنارہ کش ہوگئے اور گوشہ نشینی اختیار کر لیے۔ اس زمانے میں جب انھیں دنیا سے بہت کم لگاؤ رہ گیا تھا۔ انھوں نے اپنے شعری ذوق کی تشفی کے لیے ایک مناسب مشغلہ تلاش کرلیا۔ ان کے رگ و پے میں فارسی شاعری کا ذوق بچپن ہی سے سرایت کر چکا تھا۔ اب پھر ان کے لیے یہ جاذب توجہ بنی۔ کیونکہ سراج شعر کہنا ترک کر چکے تھے۔ اب انھوں نے ایک نیا شغل شروع کیا۔ انھوں نے فارسی اساتذہ کے دیوانوں کا انتخاب شروع کیا۔ اور 1169ء میں اسے مکمل کر کے ایک دیباچہ بھی لکھا۔ اس مجموعہ کا نام انھوں نے ''منتخب دیوانہا' رکھا۔ ''منتخب دیوانہا'' غالباً سراج کا آخری کارنامہ تھا۔ اس کے بعد سوائے خطوط شاید انھوں نے کچھ لکھا ہو۔

زندگی کے آخری دور میں سراج اورنگ آبادی کی شخصیت نہایت مقدس اور بزرگ ہوگئی تھی۔ عوام اور خواص ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ سارا شہر ان کا معتقد تھا۔ ان کی بزرگی اور شاعری کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی تھی۔ ان کے مریدوں کی تعداد کثیر تھی۔ لیکن ان کے خاص معتقدین میں ضیاء الدین' تاج الدین' شاہ چراغ کے علاوہ چند ہی معتقدین کے نام تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی تعداد کافی تھی جن میں سے ضیاء الدین پروانہ' لالہ جے کشن' بیجان' مرزا مغل کمتر' میر مہدی متین' مرزا محمود خاں نثار' محمد عطا ضیاء اور رضا بیگ خاں وغیرہ۔

سراج اورنگ آبادی کا یہ دور ان کی زندگی کا خوبصورت ترین دور تھا۔ یہ دور سراج کے لیے شہرت' عزت اور احترام کے لحاظ سے بہترین زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ انھیں شاعری میں استادی کا درجہ حاصل تھا۔ شہر کے بہت سے خوش گفتار شعراء ان کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ علاوہ ازیں سراج اورنگ آبادی کی علماء و فضلاء اور شعراء کے ہر حلقہ میں شہرت اور عزت ہوتی تھی۔ اس دور میں اورنگ آباد میں جتنے بھی بڑے اہل قلم اور فنکار موجود تھے وہ سارے ان کے دوست یا ان کے معتقد علامہ غلام علی آزاد بھی ان کے ملنے جلنے والوں میں سے تھے۔ شفیق جو پہلے سراج کو اپنا دوست سمجھتے تھے۔ ان کی بزرگی اور شہرت کے باعث ان کا احترام کرنے لگے تھے۔ ''چمنستانِ شعراء'' مصنفہ اسد علی خاں تمنا میں اس جانب اشارہ ملتا ہے۔

سراج کی عزت وتکریم پورے شہر کے علماء وزعماء اور رؤسا کے درمیان یکساں تھی اس تمام عزت وتقدس کے باوجود سراج کی سادگی کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر میں تنہا رہا کرتے تھے۔ان کی خدمت کے لیے صرف دو خدمت گار مامور تھے۔ضیاءالدین پروانہ ملازمت کے سلسلے میں بیجاپور میں مقیم تھے۔شاہ چراغ احمد نگر میں اور شاہ عبدالرسول لشکر میں رہا کرتے تھے۔شاہ تاج الدین جوان کے قریبی دوستوں میں تھے وہ بھی ان کے پاس نہیں تھے۔

سراج آخری وقت میں کئی ایک موذی مرض میں مبتلا ہوگئے۔مرض بواسیر' ضعف معدہ اور اسہال جیسے امراض میں وہ مبتلا رہا کرتے تھے۔شاہ تاج الدین کو لکھے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ سراج بعض وقت مرض کی شدت کی وجہ سے کھڑے ہونے سے بھی معذور ہوجاتے تھے۔انھیں تکالیف کے سبب انھوں نے شاہ چراغ کو جوان کے خاص دوستوں میں تھے لکھا کہ وہ ان کی خدمت میں حاضر ہوں تا کہ ان کی ہمت میں اضافہ ہوسکے۔لیکن وہ اپنی مجبوریوں کے سبب ان کے پاس حاضر نہ ہوسکے۔شاید کوئی خاص وجہ تھی جس کے باعث شاہ چراغ سراج کی خدمت میں حاضری نہ دے سکے۔سراج کی بیماری میں روز بروز شدت آتی گئی اور سراج کا اسی مرض میں 4 شوال 1177ھ مطابق 1763ء بروز جمعہ انتقال ہوگیا۔ان کی وفات پر پورے شہر میں ماتم چھایا رہا اور لوگوں نے سوگ منایا۔

میر حسن اور شمالی ہند کے بعض تذکرہ نگاروں نے سراج کو آبرو کا ہم عصر بتایا ہے۔دہلی میں اردو شاعری کی ترقی دراصل شاہ ظہورالدین حاتم اور شاہ مبارک آبرو سے شروع ہوئی۔اسی لیے اردو شاعری کے اولین دور کو انھیں کے عہد سے موسوم کیا جاتا ہے۔جس طرح اس کے بعد کے زمانے کو میر اور سودا کے عہد سے موسوم کرتے ہیں:

اپنے مطالعے کی جانچ:

1. سراج اورنگ آبادی کس مقام میں اور کب پیدا ہوئے؟
2. سراج کتنے سال تک تحصیل علوم میں مشغول رہے؟
3. سراج نے پسندیدہ غزلوں کا انتخاب کس نام سے مرتب کیا؟
4. سراج جذب کی حالت میں کس زبان میں شعر موزوں کرتے رہے؟
5. سراج کی وفات کس سنہ میں ہوئی؟
6. شمالی ہند کے تذکرہ نگاروں نے سراج کو کس شاعر کا ہم عصر قرار دیا ہے؟

3.4 سراج اورنگ آبادی کی شاعرانہ خصوصیات

ولی دکنی کے بعد سراج اورنگ آبادی کو دکنی شعراء میں اہم مقام حاصل ہے۔سراج بچپن سے حسن پرستی کی

طرف مائل تھے۔ ابھی وہ پوری طرح سنِ شباب کو بھی نہ پہونچے تھے کہ ان پر ایک طرح کی مجذوبانہ کیفیت طاری ہوگئی۔ سات برس تک یہی مجذوبانہ کیفیت ان پر چھائی رہی۔ جب یہ کیفیت سات سال کے بعد ختم ہوئی تو صوفیوں اور فقراء کے ساتھ رہنے لگے اور اسی طرح ساری زندگی بسر ہوگئی۔ جس وقت ان پر جذب و کیف کی حالت مسلط رہتی تھی، اس وقت وہ نہایت موزوں شاعری کرتے اور ان کی شاعری کی زبان فارسی تھی۔ مگر ان کا فارسی کلام ضائع ہوگیا۔

سراج اورنگ آبادی کو صوفی شعراء میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی زندگی اور تخلیقات میں بڑا گہرا تعلق ملتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کیفیات میں جوش اور بے قراری کا عنصر شدت سے محسوس کیا جاسکتا ہے۔ سراج نے تمام اصناف سخن میں شعر کہے ہیں اور صرف چوبیس سال کی عمر میں انھوں نے اپنا دیوان مکمل کرلیا۔ سراج کی ایک مثنوی ''بوستانِ خیال'' 1739ء میں لکھی جو درد انگیز آپ بیتی ہے۔ ان کی متعدد مثنویوں میں ''بوستان خیال'' زیادہ اہم ہے۔ اس میں کم و بیش گیارہ سو ساٹھ اشعار ہیں مگر یہ سراج کی صرف دو دن کی ریاضت اور مشق کا نتیجہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سراج بڑے قادرالکلام اور ذھین شاعر تھے۔ اس مثنوی کی کہانی بہت سلیس زبان میں لکھی گئی ہے۔ آپ بیتی کے انداز پر لکھی گئی یہ مثنوی سیدھی اور بہت آسان ہے۔ سراج نے اس مثنوی میں ایک شاعر اور عاشق کی زندگی کی ایسی حقیقی اور پرکشش تصویر کشی کی ہے جو کسی معمولی شاعر کے بس کی بات نہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل کی رفعت اور احساسات کی جدت و واقعیت کی بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے۔ یہ مثنوی اردو کی خاص اور اہم تصنیفات میں شمار کی جاتی ہے۔

سراج اورنگ آبادی نے ولی کی روایتِ تصوف و معرفت کو آگے بڑھایا۔ غزل کی نئی تعبیر پیش کی۔ اور اردو شاعری میں معرفت کے مضامین کو بڑی صفائی اور سلاست کے ساتھ پیش کیا۔ سراج کی شاعری حسنِ خیال، لطف گفتار اور وسعتِ تخیل کی ایک عظیم مثال ہے جس کا مطالعہ ہر زمانے میں شوق سے کیا جائے گا۔ سراج اردو کے ان شعراء میں سے ہیں جو دماغ سے نہیں دل سے شاعری کرتے تھے اور یہ شعراء کا ایک برگزیدہ طبقہ ہے جس میں ولی، میر، درد، میر حسن، میر انیس، نظیر، غالب، اقبال وغیرہ شامل ہیں۔ حقیقت میں اردو شاعری کی بہترین روایت انھیں شعرا کی بدولت قائم ہے۔ عظیم ناقد اور محقق ڈاکٹر جمیل جالبی سراج کی شاعری کا محاکمہ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

> ''سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی ولی کے بعد اور دور میر و سودا سے پہلے کی درمیانی عرصے کے سب سے بڑے شاعر ہیں جن کی پرگوئی، جوش طبع اور رنگ سخن کو کوئی دوسرا نہیں پہنچتا۔ سراج کے کلام سے یہ بات شدت سے محسوس کی جاتی ہے کہ

یہ ''آواز'' اردو شاعری میں پہلی بار سنی جارہی ہے۔اس میں ایک ایسی خود سپردگی اور
ایک ایسی سرشاری ہے کہ جواب تک کسی شاعر کے یہاں اس طرح سمٹ کر، جم کر
سامنے نہیں آئی تھی۔'' (تاریخ ادب اردو جلد اول۔صفحہ 566)

سراج کی انفرادیت ان کی مجذوبانہ کیفیت کی وجہ سے ہے۔ان کی شاعری میں تصوف کے بھرپور اور عمیق عناصر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ولی کی طرح سراج کے یہاں بھی مضامین کا تنوع اور خیالات گوناگونی ملتی ہے۔سراج کے کلام میں کسی طرح کی پیچیدگی اور ذومعانی الفاظ نہیں ملتے۔میر نے'' نکات الشعراء'' میں اور حسن نے اپنے'' تذکرہ'' میں تحریر کیا ہے کہ سراج کو سید حمزہ دکنی سے تلمذ حاصل تھا مگر دکن میں کسی شاعر کا نام سید حمزہ یا سید حمزہ علی نہیں تھا۔گمان غالب ہے کہ سراج نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔لیکن بزرگوں کی صحبت اور مشاقی نے سراج کو اپنے دور کا سب سے بڑا شاعر بناڈالا اور سراج کے کلام کی خصوصیات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں ان کی شاعری میں تکلف اور بناوٹ کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ان کی شاعری سیدھی سادی بیانیہ شاعری ہے۔

سراج نے ایک دیوان فارسی کا اور ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار اشعار شامل ہیں' اپنی یادگار چھوڑے۔ ''منتخب دیوانہا' کا ذکر اوپر آچکا ہے۔اور مثنوی ''بوستان خیال'' کا تذکرہ بھی پچھلے صفحات میں مذکور ہے۔رام بابو سکسینہ نے سراج کی شاعری کی خصوصیات مختصر لفظوں میں بیان کی ہے:

''آپ کا کلام بھی ولی کی طرح ایہام وذومعانی الفاظ سے پاک وصاف ہے۔
سیدھا سادہ بیان ہے۔تکلف و بناوٹ کا نشان نہیں۔اکثر غزلوں میں حسن وعشق
کے کرشمے بعض اشعار میں توحید ومعرفت کا نقشہ مضامین میں شگفتگی خیالات میں
بلندی اور پھر کلام میں صفائی اور سادگی موجود ہے۔ریختہ گوئی میں ولی کے قائم مقام
تھے۔دکن میں استادی کے مرتبے کو پہنچے۔ولی نے اس زمین میں جو کچھ سبزے
لگائے سراج نے ان کو اپنی توجہ کے پانی سے سیراب وشاداب کیا۔''
(تاریخ ادب اردو صفحہ 52)

ولی کی شاعری کی بنیادوں کو سراج نے کس طرح مضبوط کیا اور اسے کس انداز میں سیراب وشاداب کیا اس کا اندازہ آپ درج ذیل اشعار سے لگاسکتے ہیں۔جس میں سراج نے موسیقیت' جاذبیت' جدت' ندرت اور طراوت کی معنویت پیش کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے۔یہ چند اشعار:

خبر ِ تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباسِ برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت ِ غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

سراج کے یہاں مختلف عشقیہ کیفیات میں تمیز کرنے اور انھیں الفاظ کی گرفت میں لانے کی زبردست صلاحیت ہے۔عشق نے ان کے اندر ایک ایسا آہنگ اور احساس موسیقی پیدا کیا کہ ولی کے الفاظ سے کہیں زیادہ شگفتہ اور تر و تازہ نظر آتے ہیں'سراج کے عشقیہ جذبات میں ایک گرمی' جلانے اور تڑپانے والی کیفیت بہت نمایاں ہے اور یہ کیفیت جب سرشاری و بے خودی سے پیدا ہونے والے آہنگ آواز اور لے کو ساتھ لے کر الفاظ کے قالب میں اترتی ہے تو الفاظ زندہ ہو جاتے ہیں اور شعر منہ سے بولنے لگتے ہیں۔جمیل جالبی سراج کے شعری احساسات اور تخلیقی توانائی کا احاطہ کرنے کی ایماندارانہ کوشش کرتے ہیں۔ان کے الفاظ میں:

''دلچسپ بات یہ کہ عشق میں انتہائی شدت ہے' وارفتگی ہے' عالمِ جذب وشوق میں صحرا صحرا پھرنے اور گریبان چاک کرنے کا احساس ہے' لیکن اسی کے ساتھ اظہار بیان میں ایک ''نپا تلا پن'' ایک توازن ہے۔یہاں دل اور دماغ بیک وقت مل کر ایک وحدت بناتے ہیں۔اسی تخلیقی عمل میں سراج کی عظمت کا راز چھپا ہے۔یہی وہ شعور ہے' جو انھیں صفِ اول کا شاعر بنا دیتا ہے اور ولی کی روایت ریختہ تیزی سے اپنی چولا بدل کر اتنی آگے بڑھ جاتی ہے کہ میر کی شاعری' امکان کے افق پر ابھرنے لگتی ہے۔'' (تاریخ ادب اردو۔جلد اول صفحہ 570)

شاعری کا ملکہ سراج کی فطرت میں اس طرح ودیعت کیا گیا تھا جس طرح ایک خوشنوا پرندے میں نغمہ سرائی کا ذوق ہوتا ہے۔یہی چیز انہیں شعر کہنے پر مجبور کرتی تھی۔جتنی قلیل مدت کے اندر ان کی شاعرانہ قابلیت کا نشو ونما ہوا' وہ اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔ایک طرف فطری لگاؤ اور دوسری طرف شعرا کے کلام کے وسیع مطالعے نے سراج کے شعری مذاق اور معیار کو بہت بلند کر دیا تھا۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سراج نے اسی فطری دباؤ کے تحت شعر

کہنا شروع کیا تھا۔لیکن پھر انھوں نے اس کو اپنے مرتبے سے کم تر چیز سمجھ کر بہت جلد ترک کر دیا۔سراج کی شاعری ہر حقیقی شاعری کی طرح اتنی انفرادی خصوصیات کی مالک ہے کہ دو ڈھائی سو سال کی وسیع شعری پیداوار کے باوجود ان کی شاعری کا رنگ آج بھی سب سے الگ اور ممتاز ہے۔شعر میں سراج نے ولی سے استفادہ کیا چنانچہ وہ اپنی زندگی ہی میں ولی کے جانشین کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے تھے۔سراج ایک خاموش صناع (کاریگر) تھے جس کو اپنے کمالات کا آپ خود علم نہ ہو۔طبعاً وہ عزلت پسند واقع ہوئے تھے۔سراج کی طبیعت ایک معیّن رفتار آبجو جیسی تھی جو خاموشی کے ساتھ اپنا نغمہ سناتی ہوئی گزرتی ہے اور جس زمین پر پہنچتی ہے اسے گلزار بنا دیتی ہے۔دیکھیے سراج کا وہی انداز جو خاموشی سے اپنی شعری حسیت کا پیغام کتنی خوبصورتی سے پہنچاتا ہے۔

ایک دن نین جھروکے کی طرف سیں گزرو
مردم چشم ہے بے تاب میری آنکھوں میں
ارے غم صبح آنے کی خبر ہے سرو قامت کی
قیامت کل کوں آتی ہے عمل کرلے تو آج اپنا
زنجیر بھلی ، قید بھلی ، موت بھی جیوں تیوں
پن حق نہ کرے کس کوں گرفتار کسی کا

سراج کی شاعری مجسم درد ہے اور حقیقت سے وہ بخوبی واقف تھے۔چنانچہ بار بار اس درد کا ذکر کرتے ہیں اور درد کی کیفیت اتنی شدید ہوتی ہے کہ قاری اسے اپنا درد محسوس کرنے لگتا ہے۔

ازل سے مجھ کو دیا درد صانع تقدیر — میرے نصیب کے شربت میں زہر گھول چکا
کوئی ہمارے درد کا محرم نہیں — آشنا نہیں ، دوست نہیں ، ہمدم نہیں
عالمِ دیوانگی کیا خوب ہے — بے کسی کا واں کسی کو غم نہیں
کسی کو راز پنہاں کی خبر نہیں — ہمارے درد کوں کم جانتے ہیں
طبیباں پاس جانا درد سر ہے — جگر کے درد کوں کم جانتے ہیں
جہاں مجھ غم کی آتش جلوہ گر ہے — وہاں دوزخ کا قصہ مختصر ہے

یہ درد و سوز میر کے کلام کی بھی ایک نمایاں خصوصیت ہے لیکن ان کا مخصوص نغمہ یاس ہے اور وہ اس مضمون کے بادشاہ ہیں لیکن سراج کے پاس ایک احساس قناعت ، تسلیم و رضا ، سپردگی بلکہ درد میں لذت کی چاشنی موجود ہے۔

ان کے یہاں انتقام یا شکایت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ان کی اہم خصوصیات ان کا دردانگیز انداز ہے اور یہ خصوصیت نہ صرف ان کی غزل میں موجود ہے بلکہ ہر صنف کلام میں یہی تاثیر اور صفت پائی جاتی ہے۔ان کی ایک مثنوی کا عنوان ہی ''سوز و گداز'' ہے۔یہ دراصل سراج کی متصوفانہ اور روحانی زندگی کا مسلک تھا اور یہی ان کی عین حیات تھی۔اس کے ساتھ ساتھ صبر و قناعت کا جو احساس ان کے کلام میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔اس سے اس کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اپنی قسمت کے غم و رنج میں شاکر ہوں سراج
جو منجم نے ازل کے میری تقویم کیا

سراج کا عقیدہ تھا کہ ہستی محبت کے سوا اور کچھ نہیں۔عشق، برق جاں سوز ہے لیکن یہ سوز لذت سے خالی نہیں۔ انھیں اس سودے میں نفع کی فکر نہیں رہتی بلکہ اس برق جگر سوز کی روشنی میں انھیں حقیقتِ دنیا نظر آ گئی۔یہ شعر دیکھیے۔

روشن ہے سبب عشق کے کیفیت عالم
آئینہ دل ساغر جمشید ہوا ہے

محبت کے جذبے کے غیر اختیاری ہونے کا بھی انھیں پورا یقین تھا۔چنانچہ فرماتے ہیں:

ہے بسمل شمشیر نگہ ذوق میں اپنے
دل حشر میں کس مونہہ ستی فریاد کرے گا
مت کرو شمع کوں بدنام جلاتی وہ نہیں
آپ میں شوق پتنگوں کو ہے جل جانے کا

ان کے نزدیک عشق کی بدولت جو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں وہ عاشق کا طرہ امتیاز ہیں۔اسے وہ عاشق کی معراج تصور کرتے ہیں:

تڑپنا تلملانا غم میں جلنا خاک ہو جانا — یہی ہے افتخار اپنا یہی ہے اعتبار اپناں
عشق نے خوں کیا ہے دل جس کا — پارۂ لعل اشک ہے تس کا
چشم ساقی کے وصف لکھتا ہوں — لے قلم ہات شاخ نرگس کا
تم نے پائے ہو حسن کی دولت — پوچھتے کب ہو حاصل مفلس کا
بے کسی مجھ سیں آشنا ہے سراج — نہیں تو عالم میں کون ہے کس کا

اپنے مطالعے کی جانچ:

7. سراج نے اپنا دیوان کس عمر میں مکمل کیا۔

8. سراج کی مثنوی کا نام لکھیے۔

9. چلی سمت غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا۔ اِس کا مصرع ثانی بتایئے؟

3.5 سراج اورنگ آبادی کی غزل (1)

قد ترا سرو رواں تھا مجھے معلوم نہ تھا — گلشن دل میں عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

دھوپ میں غم کی، عبث جی کوں جلایا افسوس — اس کے سایہ میں اماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

یار نے ابرو و مژگاں میں مجھے صید کیا — صاحب تیر و کماں تھا مجھے معلوم نہ تھا

سب جگت ڈھونڈ پھرا یار نہ پایا لیکن — دل کے گوشہ میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

خاک تیرے قدمِ پاک کی اے نور نگاہ — سرمہ دیدۂ جاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

روزہ داران جدائی کوں خم ابروے یار — ماہ عید رمضاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

نگہ شوخ نے دل ایک کرشمہ میں لیا — کیا بلا سیف زباں تھا مجھے معلوم نہ تھا

شب ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثل سراج
رخ ترا نور فشاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

3.5.1 مجموعی تاثر

یہ پوری غزل تصوف کے موضوعات پر مشتمل ہے۔ مگر سراج نے اس میں تصوف کے مسائل اپنی لاعلمی کی زبان سے ادا کیے ہیں اور اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر اپنی ہر اس لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں جو ان کے ذہن و دل کے دریچے نے انھیں محسوس کرایا۔ یہ پوری غزل نہایت تسلسل کے ساتھ اظہار بیان کا خوبصورت مرقع ہے جس میں غنائیت، موسیقیت اور لفظ و معانی کی ایک حسین دنیا موجود ہے۔ ہر جگہ شاعر کو خدا ہی خدا دکھائی دیتا ہے۔ اور سراج اپنی لاعلمی کا اظہار اس انداز میں کرتے ہیں کہ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ اس یار کا نام و نشان بھی ہے۔ اس کا نام و نشاں موجود ہے۔ میں بس یہی خیال کرتا تھا۔ سراج کی یہ پوری غزل علم معرفت کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے۔

3.5.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر کہتا ہے مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ تیرا قد اس سرو درخت کی طرح

خوبصورت، طویل اور جاذب نظر ہے۔اور مجھے اس بات کی بھی خبر نہیں تھی کہ تو میرے دل میں ہی جلوہ گر ہے۔یعنی گلشن دل میں ہی ظاہری طور پر موجود تھا مجھے اس بات کی کوئی خبر نہیں تھی۔ایک فلسفہ اس میں موجود ہے کہ خدا کو ہم ہر طرف ڈھونڈتے ہیں، مگر وہ ہمارے دل میں موجود ہوتا ہے۔ہمیں اس کی خبر نہیں ہوتی اور نہ ہی ہمارے پاس اتنی صلاحیت ہے کہ ہم اسے دیکھ سکیں اور محسوس کر سکیں مگر عشق حقیقی میں مبتلا افراد اس چیز کو محسوس کرتے ہیں۔

دوسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ میں نے بیکار دھوپ کی شدت میں اپنے جی کو جلایا۔اس کے سایہ گرم میں سکون واطمینان تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا۔دھوپ سے مراد ادھر ادھر پریشان ہونا دوسروں کے در دولت پر سر نیاز خم کرنا ہے۔ہمیں تو صرف خدا کی ذات کا سہارا لینا چاہیے۔اس میں شاعر نے قرآن کی اس آیت کی پوری تفسیر پیش کر دی ہے جس میں خدا فرماتا ہے کہ دلوں کو خدا کے ذکر سے ہی اطمینان حاصل ہوتا ہے۔پورا شعر تصوف کے اثر سے مملو ہے۔

تیسرا شعر: ایک استعاراتی انداز کا یہ شعر ہے جس میں شاعر نے اپنے محبوب کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ میرے یار نے بھوؤں اور مژگاں سے میرا شکار کیا۔یعنی اس کی آنکھوں کی دلفریبی نے اس کے دام میں گرفتار ہونے پر مجبور کیا۔مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ تیر وکمان رکھتا ہے۔یہاں شاعر نے ابرو مژگاں کو تیر وکمان سے تشبیہ دی ہے۔دونوں میں شکلاً مماثلت پائی جاتی ہے۔صنعت تشبیہ کی خوبی اس شعر میں موجود ہے۔

چوتھا شعر: اس شعر میں ایک عام صداقت کا اعلان ہے کہ یعنی محبوب حقیقی کو میں نے پوری دنیا میں تلاش کر لیا۔لیکن ہمیں اس کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملا۔وہ تو ہمارے دل کے گوشے میں ہی پوشیدہ تھا اور مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔یہ بات بہت سے شعرا نے کہی ہے مگر سراج نے سادگی اور سلاست سے پر الفاظ میں کتنی خوبصورتی سے پیش کر دی ہے یہ سراج کی ہی خوبی ہے۔

پانچواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ تیرے قدم پاک کی خاک جان کی آنکھ کے لیے سرمہ تھا۔مجھے معلوم نہیں تھا۔یعنی اے نور نگاہ میری آنکھوں کا نور تیری قدموں کی دھول تو ہمارے لیے سرمہ تھا کاش میں نے یہ بات سمجھ لی ہوتی۔سرمہ کو خاک کی صفت سے تشبیہ دیا ہے اور اپنے دل کی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ میری لاعلمی کس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ میں اتنی چھوٹی سی بات بھی نہ سمجھ سکا۔

چھٹا شعر: اس شعر میں شاعر نے اس ذات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا وجود دنیا میں نظر نہیں آتا لیکن سارے لوگ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کا نام ونشان کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہے۔وہ کہتا ہے کہ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ اس کا نام ونشان کہیں موجود ضرور ہے مگر بعد میں یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی کہ اس کا تو کوئی نام ونشان ہی موجود نہیں ہے

یعنی وہ جسم وجسمانیات سے بالکل پاک ہے۔ یہاں شاعر نے خدا کی ذات کی طرف اشارہ کر کے اپنی بات کو نہایت عمدگی اور صفائی کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ کسی طرح کی پیچیدگی یا تشکیک کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی ہے۔ یہی تو سراج کی شاعری کا اہم وصف ہے۔

ساتواں شعر: شاعر کہتا ہے کہ جو روزہ دار ہوتے ہیں ان کے لیے عید کا مژدہ کتنا خوش کن ہوتا ہے۔ اسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سراج کہتے ہیں کہ جو لوگ جدائی کے روزہ دار ہوتے ہیں یعنی محبوب کی جدائی سے اپنے دل کو تھام لیتے ہیں اور اس کے غم میں، اس کی یاد میں کچھ کھاتے پیتے نہیں ان کے لیے اس کے ابرو کے خم میں عید کا چاند دکھائی دیتا ہے۔ رمضان کے بعد عید کا چاند جب نمودار ہوتا ہے تو روزہ داروں کے لیے کتنی خوشی کی گھڑی ہوتی ہے۔ ان کے چاہنے والوں کے لیے اس کے ابرو کے خم میں چاند کی صورت نظر آتی ہے۔ اس شعر میں چاند کی تشبیہ محبوب کے ابرو سے دی گئی ہے اور دوسری طرف اشارہ اس بات کا ہے کہ جس طرح روزہ داروں کو عید کا چاند دیکھ کر خوشی ہوتی ہے اسی طرح محبوب کے چاہنے والوں کو اس کے ابرو کا خم دیکھ کر وہی خوشی ہوتی ہے جو روزہ داروں کو چاند دیکھ کر ہوتی ہے۔ گویا محبوب کا ابرو عید کا چاند ہے۔ کتنی خوبصورت تشبیہ ہے۔

آٹھواں شعر: شوق کی نگاہ نے میرا دل ایک ہی جھٹکے میں لے لیا۔ یعنی میں اپنے آپ سے بے خبر ہو گیا۔ اس کی زبان میں کیسی تلوار کی کاٹ ہے، مجھے معلوم نہیں تھا۔ اس کی زبان کو سیف یعنی تلوار سے مشابہت دی گئی ہے اور اس شوخ کی نگاہ کو ایک ضرب پہنچانے والی شے قرار دیا ہے۔ یعنی عاشق کو اس کی شوخ نگاہوں نے ایک ہی ضرب میں گرفتارِ دام کر کے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس کی زبان میں کس بلا کی تاثیر تھی۔

نواں شعر: جس طرح سراج کو یعنی چراغ کو جدائی کے غم میں تاب نہیں رہتی اور وہ چراغ جدائی کی طرح پوری رات جلتا ہی رہتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیرا حسن تیرا چہرہ اس قدر روشن تھا جیسے چراغ روشن ہوتا ہے۔ میں اس حسن میں کھو گیا اور تیری جدائی میں چراغ کی طرح پوری رات جلتا رہا۔ مجھے تمہاری خوبصورتی اور تمہارے نور کا اندازہ ہی نہیں تھا۔ یہاں سراج نے اپنے تخلص سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

10. تیسرے مصرعے میں شاعر نے ''ابرو مژگاں'' کو کس چیز سے تشبیہ دی ہے؟
11. ''میں سمجھتا ہوں کہ اس یار کا ہے نام ونشاں'' میں یار سے کیا مراد ہے؟
12. شب ہجراں کی نہ تھی تاب مجھے مثل چراغ میں شب ہجراں سے کیا مراد ہے؟

3.6 سراج اورنگ آبادی کی غزل (2)

خبرِ تحیرِ عشق سن نہ جنون رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بے خبری رہی
شہِ بے خودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی
چلی سمت غیب سیں اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں
کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی
وہ عجب گھڑی تھی میں جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق میں جوں دھری تھی تیونہی دھری رہی
ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر سیں یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں رہی جلا نہ پری کوں جلوہ گری رہی
کیا خاک آتشِ عشق نے دل بے نوائے سراج کوں
نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی

3.6.1 مجموعی تاثر

یہ غزل طویل بحر میں ہے مگر اس میں ایک خاص موسیقیت ہے کہ قاری کو اپنی لے میں گرفتار کر لیتی ہے۔ خدا کی یاد میں جو لوگ غرق ہوتے ہیں انھیں ایسی استعجاب اور حیرت کی دنیا کی سیر کرنی ہوتی ہے جہاں پہنچ کر ''تو'' اور ''میں'' کا فرق ختم ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ذات واحد کی یاد رہتی ہے۔ اور وہی ہر طرف دکھائی دیتا ہے۔ پوری غزل تصوف کی ترجمانی کرتی ہے اور اس لمحے کی بیانیہ تصویر کشی کرتی ہے جس لمحہ عشق کو محبوب کا وصال نصیب ہوتا ہے اس وقت عاشق پر کیسی کیفیت طاری ہوتی ہے اور کن آزمائشوں سے گزرتا ہے۔

3.6.2 اشعار کی تشریح

پہلا شعر: پہلے شعر میں شاعر اس کیفیت کو بتاتا ہے جو حیرتِ عشق کی ہوتی ہے۔ یعنی تو اب عشق کی حیرت کی

خبر سن کہ اس کے عشق میں نہ جنوں رہا نہ پری رہی۔ اور اس حالت میں نہ تو تو رہا اور نہ میں رہا۔ یعنی نہ تجھ کو تمہاری خبر تھی اور نہ ہمیں اپنے وجود کا احساس تھا بس ایک بے خبری کا عالم تھا۔ عشق کی تحیر کی کیفیت کا اظہار جب عشق کی بلندی کی منزل پر جب عاشق پہنچ جاتا ہے تو اسے دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ نہ اس کو اپنی ذات کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی کسی شے کے وجود کا۔ بس ایک ہی چیز اس کو یاد رہتی ہے اور وہ ہے محبوب۔

دوسرا شعر: اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ بے خودی کے بادشاہ نے مجھے برہنگی کا لباس عطا کیا ہے اور اس لباس کو زیب تن کرنے کے بعد نہ اب ہوش باقی رہا اور نہ جنوں کی بخیہ گری کا احساس ہے۔ میں اب ہوش و خرد سے عاری ہو چکا ہوں۔ یہی اس لباس کی خصوصیت ہے کہ جو اس کو پہنتا ہے اسے ہوش و حواس سے بے خبر ہو جانا پڑتا ہے۔ اور دل میں صرف ایک ہی چیز موجود ہوتی ہے وہ ہے اس کا عشق یعنی محبوب حقیقی کا عشق۔ اس شعر میں شاعر نے ہوش و خرد اور جنوں کا لفظ استعمال کر کے شعری حسن قائم کیا ہے۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ غیب کی جانب سے ایک ایسی ہوا چلی کہ اس ہوا نے ظاہری چمن کو خاکستر بنا دیا۔ مگر ایک شاخ جس پر غم کی جلوہ گری تھی وہی شاخ ہری رہی۔ اور باقی تمام چمن جل کر راکھ ہو گیا۔ شاعر نے بڑی خوبصورت منظر کشی کی ہے ظہور کے چمن کی یعنی وہ چیز جو ظاہری طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ جب اس آگ کے شعلے لپکتے ہیں تو تمام ظواہر غائب ہو جاتے ہیں۔ اس شعر میں شاعر نے اس کیفیت کو بیان کیا ہے کہ جسے عشق ہوتا ہے بس وہی انسان زندہ رہتا ہے ورنہ بے عشق لوگ بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ اس ہوا میں اتنی تاثیر ہے کہ وہ ظاہری تمام چیزوں کو ختم کر دیتی ہے مگر جو غم عشق میں پیدا ہوتا ہے صرف وہی باقی رہتا ہے اور اس غم کو شاعر نے نہال غم سے تعبیر کیا ہے۔ نہال کے معنی خوشی ہے۔ شاعر نے دو متضاد لفظوں کا استعمال کر کے شعر کے حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔

چوتھا شعر: میں اپنے یار کی نظر کے تغافل کا شکوہ کس زبان سے کروں کہ وہ کس طرح مجھ سے غافل ہے اور اس کی غفلت کی وجہ سے میری کیا کیفیت ہے۔ آرزو کے سو پیالوں کی شراب جو دل کے خم میں تھی وہ بھری کی بھری رہی۔ میں اس کی ایک غفلت کا شکوہ کیا کروں یہاں تو پورا دل آرزو کے شراب سے پُر ہے تو صرف ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کی شکایت کیا کروں۔ یہاں لفظ قدح کا مطلب پیالہ ہوتا ہے اور صد کا معنی سو کے ہیں۔

پانچواں شعر: شاعر اس شعر میں اس وقت کی حالت کو بیان کرنا چاہتا ہے جس وقت اس نے عشق کی وادی میں قدم رکھا تھا۔ کہتا ہے کہ وہ عجیب سماں تھا جب میں نے عشق کے نسخے کا سبق لیا تھی یعنی عشق کی شروعات کی تھی۔ اس وقت جو عقل کی کتاب تھی وہ طاق پر جیسی دھری تھی ویسی ہی دھری رہی۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں

شاعر نے عشق کی بالادستی عقل پر دکھائی ہے یعنی عقل کی دولت عشق کی دولت کے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ عشق کی منزل عقل کی منزل سے کافی اونچی ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ عشق میں عقل کی ضرورت ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ عقل ہر کام کرنے میں بڑی فکر اور سوچ میں مبتلا ہوتی ہے پھر اس کام کو کرتی ہے یا اس سے انکار کرتی ہے مگر عشق کے اندر سوچنے کا کوئی تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ صرف عمل میں یقین رکھتا ہے۔ یہ شاعر کا اصل طرہ ہے جسے اس نے اپنی استادی سے بیان کیا ہے۔

چھٹا شعر: شاعر کہتا ہے کہ تیرے حسن کے جوش کی حیرت کا اس قدر اثر ہوا کہ آئینہ بھی اپنی شفافیت کھو چکا اور پری کی جلوہ گری بھی ختم ہو گئی۔ یعنی شاعر اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں آئینہ کی چمک اور پری کی جلوہ گری کو بھی ہیچ قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تیرے حسن کی دولت میں اتنی تاثیر ہے کہ آئینہ اور پری نے اپنی حقیقت اور ماہیت کھو دی ہے اور یہ دونوں حسن کی گرمی سے خاک ہو گئے ہیں۔

ساتواں شعر: غزل کے آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ عشق کی آگ نے بینوا سراج کے دل کو خاک بنا ڈالا ۔کہ اس کے بعد نہ کوئی خطرہ رہا نہ کوئی چیز باقی رہی بس ایک بے خطری کی کیفیت ہمارے اوپر طاری ہے۔ یعنی عشق میں جلنے کے بعد انسان کو دنیا کی کوئی پرواہ نہیں رہتی اور نہ ہی کسی چیز سے بچنے کا احساس باقی رہتا ہے۔ اس آگ میں جل کر انسان کو ایک بے خطری پیدا ہو جاتی ہے یعنی اب وہ کسی چیز سے خطرہ محسوس نہیں کرتا ہے اور ہر جگہ بے خطر رہتا ہے اقبال نے بھی اس فلسفے کو اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔ شاعر نے یہاں عشق کی حکومت کا ذکر کیا ہے جس پر عشق حکومت کرتا ہے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ تمام دنیا سے بے خطر ہو کر جیتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

13. سراج کی اس غزل میں کس چیز کی بالادستی موجود ہے؟
14. وہ عجب گھڑی تھی جس گھڑی لیا درس نسخہ عشق کا 'نسخہ عشق' سے کیا مراد ہے؟
15. پوری غزل کس رنگ میں رنگی ہوئی ہے؟
16. سراج کی یہ غزل کیوں مشہور ہے؟
17. کیا خاک آتشِ عشق نے دل بینوائے سراج کو مصرع ثانی لکھ کر مکمل کیجیے۔

3.7 خلاصہ

سید سراج الدین سراج اورنگ آبادی جنوبی ہند کے تیسرے بڑے شاعر تھے۔ سراج کا مولد اورنگ آباد

ہے جہاں وہ 1714ء میں پیدا ہوئے۔ آپ سادات حسینی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں ہی ہوئی۔ 12 سال کی عمر تک تعلیم حاصل کرتے رہے اور بعد ازاں ان پر جذب کی کیفیت طاری ہوگئی اور صحرانوردی کے لیے نکل پڑے۔ اور اسی جذب کی حالت میں فارسی اشعار ان کی زبان پر جاری ہوتے تھے۔ 24 سال کی عمر میں انھوں نے اپنا دیوان مکمل کیا۔ مختلف شعراء کے کلام کا انتخاب بعنوان ''منتخب دیوانہا'' کے نام سے ترتیب دیا۔ ایک مثنوی بوستان خیال 1747ء میں لکھی جو کافی مشہور ہوئی۔ سراج نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ 1147ء میں سراج نے حضرت شاہ عبدالرحمٰن کے دست مبارک پر بیعت کی۔ اس وقت سراج کی عمر 24 سال تھی۔ وہ ابھی لاابالی پن کی زندگی گزارتے تھے۔ سراج جب اپنے مرشد کی خدمت سے الگ ہوتے تو ان کا زیادہ تر وقت شعر موزوں کرنے میں گزرتا تھا۔ ان کے یہاں دوست واحباب کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ سراج کی شاعری میں عشق کی کیفیت کی سربلندی پائی جاتی ہے۔ الفاظ کے انتخاب میں انکا جواب نہیں۔ سلیس اور رواں زبان میں اپنے اشعار لکھتے ہیں اور ان کے اشعار میں ایک خاص قسم کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ تصوف ومعرفت کا رنگ ان کی پوری شاعری میں چھایا ہوا معلوم ہوتا ہے اور یہی رنگ ان کے اکثر وبیشتر غزلوں پر غالب ہے۔ سراج نے خطوط بھی لکھے اور مختلف مثنویاں بھی لکھیں۔ مثنوی بوستان خیال میں ایک ہزار سات ابیات ہیں۔ اور گل وبلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی موجود ہے۔ سراج کا 1763ء میں انتقال ہوا۔

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے؟

1. سراج کے یہاں عشق کی بالادستی موجود ہے۔ اظہار خیال کیجیے۔
2. سراج کی غزل دوم کا خلاصہ پیش کیجیے۔
3. مثنوی ''بوستان خیال'' پر اظہار کرتے ہوئے سراج کے شعری اوصاف لکھیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے؟

1. سراج کی زندگی کے اہم کارناموں کا ذکر کیجیے۔
2. سراج اورنگ آبادی کی شاعری کی خصوصیات مع مثال تحریر کیجیے۔
3. سراج کے دوست، مشائخ اور مرشد کے سوانحی اوصاف بیان کیجیے۔

3.9 فرہنگ

دواوین	دیوان کا جمع۔شاعر کے موت کے بعد اس کا شعری مجموعہ جو منظ [illegible] پر آئے
اصناف سخن	شاعری کی مختلف قسمیں مثلاً غزل، نظم، قصیدہ، رباعی وغیرہ
آپ بیتی	اپنی زندگی کی روداد، زندگی کے حقائق کا بیان
سوزجگر	دل کی تڑپ، جگر کی تپش
محویت	خیال میں گم، غرق ہونا، استغراق
سرشاری	لبریز ہونا، نشے میں چور ہونا، لبالب، چھلکتا ہوا
شغف	بے حد محبت، بے انتہا رغبت، غایت درجہ دلچسپی
صحرانوردی	جنگلوں میں آوارہ پھرنا۔ بیابان میں پھرنا
ریختہ	پڑا ہوا، بکھرا ہوا۔ اردو جو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے۔
معتقد	عقیدہ رکھنے والا، اعتقاد رکھنے والا
خوش گفتار	اچھی گفتگو کرنے والا۔ عمدہ بات کرنے والا
چمنستان	باغ، پھولوں کا باغ، پھلواری، گلزار
قادرالکلام	کلام پر قابو اور قدرت رکھنے والا
تخیل	قوت متخیلہ، تصور، خیال
محاکمہ	دعویٰ، فیصلہ، انصاف طلبی
تحیرعشق	عشق کی حیرت انگیزی
نہال غم	غم کی خوشی
صناع	کاریگر، ہنر مند، فنکار
آبجو	چشمہ، ندی، نالہ، نہر
شعری حسیت	اشعار کی خوبی محسوس کرنے کی قوت
صانع تقدیر	تقدیر بنانے والا، اللہ تعالیٰ
منجم	علوم نجوم میں ماہر۔ ستارہ شناسی کا ماہر

3.10 معاون کتابیں

1. کلیات سراج — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
2. تاریخ ادب اردو (جلد اول) — جمیل جالبی
3. اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — سید احتشام حسین

3.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اورنگ آباد میں 1714 میں
2. 12 سال تک
3. ''منتخب دیوانہا''
4. فارسی زبان میں
5. 1763 میں
6. آبرو کا
7. چوبیس سال کی عمر میں
8. بوستانِ خیال
9. مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی
10. تیر و کمان سے
11. خدا کی ذات
12. جدائی کی رات
13. عشق کی
14. عشق کی ابتدائی کیفیت
15. تصوف کے رنگ میں
16. سادگی موسیقیت اور عشق کی خصوصیات کی منفرد انداز بیانیہ کی وجہ سے
17. نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بے خطری رہی۔

اکائی: 4 ولی اورنگ آبادی

ساخت

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 ولی اورنگ آبادی: حیات

4.4 ولی کی غزل گوئی کی خصوصیات

4.4.1 حقیقت پسندی

4.4.2 تصوف

4.4.3 حسن وعشق کا بیان

4.4.4 زبان وبیان

4.4.4.1 تشبیہ واستعارہ 4.4.4.2 صنعت مبالغہ

4.4.4.3 صنعت مراعات النظیر 4.4.4.4 صنعت تضاد

4.4.4.5 صوتی آہنگ

4.5 پہلی غزل: متن

4.5.1 مجموعی تاثر 4.5.2 تشریح

4.6 دوسری غزل: متن

4.6.1 مجموعی تاثر 4.6.2 تشریح

4.7 خلاصہ

4.8 فرہنگ

4.9 معاون کتابیں

4.10 نمونہ امتحانی سوالات

4.11 اپنے مطالعے کی جانچ: نمونہ جوابات

4.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں ولؔی اورنگ آبادی کی حیات اور شخصیت کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا جائے گا اور ولؔی کی شاعرانہ خصوصیات بھی اُجاگر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ولؔی کی دونوں غزلوں پر مجموعی تبصرے کے ساتھ ساتھ تمام اشعار کی تشریح بھی عام فہم زبان میں پیش کی جائے گی۔ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ولؔی کی شخصیت، شاعری، جمالیات، زبان اور ان کے رنگ وآہنگ سے خاطر خواہ واقف ہوسکیں گے۔

4.2 تمہید

ولؔی کو اردو شاعری کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اردو شاعری میں ایک طرز خاص کے موجد ہیں۔ ولؔی سے قبل اردو شاعری کی روایت دکن میں ملتی ہے جبکہ شمالی ہند میں فارسی شاعری کا چرچا تھا۔ ولؔی نے اردو غزل کو شمالی ہند میں رواج دے کر نہ صرف اردو شاعری کی روایت کو آگے بڑھایا ہے بلکہ اردو شاعری میں شمال اور جنوب کو ملانے کا اعزاز بھی انھیں حاصل ہے۔ ولؔی جمال پرست شاعر ہیں، اسی لیے حسن وعشق ان کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض اہم انسانی صفات مثلاً قناعت پسندی، ہمدردی، محبت واخلاص، اخوت وبھائی چارگی کا درس دے کر اپنی شاعری میں تصوف کا رنگ بھی بھر دیا ہے۔ ان کے یہاں کیف وسرور کی کیفیت بھی نظر آتی ہے اور زبان وبیان کا لطف بھی۔ ان سب سے بڑھ کر ولؔی نے دکنی غزل کی اہم خصوصیت یعنی حقیقت پسندی کی روایت کو آگے بڑھا کر دکنی شاعری کو جلا بخشی ہے۔ ان کی شاعری کے مذکورہ اوصاف اردو شاعری میں آج بھی انھیں زندہ وپائندہ بنائے ہوئے ہیں۔

4.3 ولؔی اورنگ آبادی: حیات

ولؔی اورنگ آبادی کی تاریخ پیدائش، مقام پیدائش اور نام کے سلسلے میں محققین میں اختلاف رائے ہے۔ بعض کے مطابق ولؔی گجراتی ہیں تو بعض ان کو اورنگ آبادی مانتے ہیں لیکن سبھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ وہ 1668ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا نام ولی محمد اور تخلص ولؔی تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اورنگ آباد میں حاصل کی اور بعد میں احمد آباد میں شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ میں تعلیم مکمل کی۔ یہیں شاہ نورالدین سہروردی کے مرید ہوئے۔ ولؔی، اورنگ آباد کو چھوڑ کر گجرات کیوں گئے، اس کی وضاحت کرتے ہوئے عبادت بریلوی لکھتے ہیں:

''اورنگ زیب عالمگیر کی جنگی کارروائیوں نے سارے دکن اور خصوصاً اس کے صدر مقام اورنگ آباد کو ایک میدان کارزار بنا دیا تھا۔ وؔلی نے جب اس شہر میں آنکھ کھولی تو اس آشوبِ قیامت کو دیکھا اور جنگ کے جو اثرات ہوتے ہیں ان کو شدت سے محسوس کیا۔ اس صورت حال سے نجات پانے کے لیے وؔلی نے احمد آباد گجرات کی طرف ہجرت کی اور وہاں ان کے مرشد کامل حضرت شاہ نورالدین سہروردیؒ سے وابستگی اور حضرت شاہ وجیہ الدینؒ کے مدرسے کی فضا نے ان کے لیے آغوش مادر کا کام کیا اور وہ یہیں کے ہو رہے''۔

ولی نے ایک بزرگ زادے ابوالمعالی کے ساتھ 1112ھ، مطابق 1700ء میں دہلی کا سفر کیا تو دیکھا کہ وہاں فارسی زبان میں شاعری کا رواج ہے۔ بیدؔل، خان آرزؔو، سعد اللہ گلشن، فراقؔ، ندیؔم اور فطرتؔ وغیرہ اس وقت فارسی میں شاعری کررہے تھے۔ شمالی ہند میں اُردو کا چلن ضرور تھا مگر شعروادب کے لیے فارسی کو ہی معیاری زبان سمجھا جاتا تھا۔ جب وؔلی کا دیوان دہلی پہنچا اور وؔلی نے سعد اللہ گلشن کے مشورے پر اپنی زبان میں فارسی زبان کے الفاظ کو استعمال کرکے ایک نیا طرز اختیار کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے اس نئی زبان کے چرچے شمالی ہند میں بھی عام ہونے لگے۔ ولی کی زبان سے متاثر ہوکر نہ صرف ان کے ہم عصر بلکہ بعد کے شعرا نے بھی ان کی زمینوں میں شاعری کی اور اپنے کلام میں ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں، جن میں وؔلی کی زمینوں میں اس عہد کے شعرا کا کلام ملتا ہے۔

وؔلی :	روح بخشی ہے کام تجھ لب کا	دم عیسیٰ ہے نام تجھ لب کا
آبرؔو :	مست دل ہے مدام تجھ لب کا	جام صہبا ہے نام تجھ لب کا

*

وؔلی :	بات میٹھی تیرے لباں کی صنم	حد انگیز شہد و شکر ہے
حاتؔم :	حق میں عاشق کے تجھ لباں کا بچن	قند ہے نیشکر ہے شکر ہے

*

وؔلی :	خوب رو خوب کام کرتے ہیں	یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
فائزؔ :	جب سجیلے خرام کرتے ہیں	ہر طرف قتل عام کرتے ہیں

ولی : کیا ہو سکے جہاں میں تیرا ہم سر آفتاب
تجھ حُسن کی اگن کا ہے یک اخگر آفتاب

میر : منھ دھونے اس کے آتا تو ہے اکثر آفتاب
دکھاوے گا آفتابہ کوئی خود سر آفتاب

*

شمالی ہند کے اکثر شعرا ولی کی شاعری سے متاثر نظر آتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی عظمت کا اعتراف بھی بعض کے کلام میں ملتا ہے۔ مثلاً:

میر تقی میر: خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن تھا

*

حاتم : حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں
لیکن ولی ولی ہے جہانِ سخن کے بیچ

*

آبرو : آبرو شعر ہے تیرا اعجاز
گو ولی کا سخن کرامت ہے

غرض ولی کے کلام کی مقبولیت سے شمالی ہند میں غزل گوئی کی راہ ہموار ہوئی اور بعد کے آنے والوں نے ان سے متاثر ہو کر صنف غزل کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ ولی نے کم و بیش تمام اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مطبوعہ کلیات میں غزلیں، مثنویاں، رباعیات، مستزاد، مخمس، ترجیع بند اور قطعات وغیرہ شامل ہیں لیکن غزل ان کی محبوب ترین صنف سخن ہے۔ اسی لیے انھوں نے اسی میں اپنی فکر رسا کے جوہر خوب دکھائے ہیں۔ اردو ادب کا یہ تابندہ ستارہ 1707ء میں خالق حقیقی سے جا ملا۔ ان کا مزار احمد آباد میں نیلی گنبد کے قریب مزار موسیٰ ساگ اور شاہی باغ کے درمیان موجود ہے۔

ولی نازک خیال اور حد درجہ حساس انسان تھے۔ وہ فطرتاً ملنسار واقع ہوئے تھے۔ محبت ان کا مسلک تھا، خاص طور پر صوفیائے کرام اور بزرگان دین سے انھیں گہری عقیدت تھی اور وہ ان سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور جو لو

گ ولی کے مزاج سے واقفیت رکھتے تھے، وہ ان سے بے اختیار محبت کرتے تھے۔ غرض اپنے ہم عصر شعراء، امراء، دوست واحباب سب سے ولی کا برتاؤ اور سلوک نہایت مخلصانہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ولی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ولی خاصے ملنے جلنے والے آدمی تھے۔ ان کے احباب کا حلقہ خاصا وسیع تھا اور بعضوں سے تو ان کی محبت عشق کی سرحدوں میں داخل ہوگئی تھی۔''

(ولی اورنگ آبادی، ص 29)

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1۔ ولی کا پورا نام کیا تھا؟

2۔ ولی اورنگ آبادی کہاں پیدا ہوئے تھے؟

3۔ ولی کس پیر کے مرید بنے تھے؟

4.4 ولی کی غزلوں کی خصوصیات

یہ بات پچھلے صفحات میں بیان کی جا چکی ہے کہ ولی نے تمام اصناف سخن، مثلاً: غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعات وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی شہرت ان کی غزلوں کی سبب سے ہی ہے۔ ان کی غزلیں سادگی، سلاست، شیرینی وترنم، کیف وسرور اور تاثر کی بدولت اپنی انفرادی شان رکھتی ہیں۔ ان کے کلام کی سب سے اہم خوبی ان کی زبان کی صفائی اور سادگی ہے۔ دکنی شاعر ہونے کے باوجود ان کے یہاں دکنی کے مشکل الفاظ کا استعمال بہت کم ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے نہایت آسان اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔ مثال کے لیے چند شعر پیش ہیں:

جسے عشق کا تیر کاری لگے
اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

*

خوب رو خوب کام کرتے ہیں
اک نگہ میں غلام کرتے ہیں

*

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا

ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا

ولی کی غزلوں میں ہمیں حقیقت پسندی بھی ملتی ہے، حسن و عشق کے جلوے بھی نظر آتے ہیں اور تصوف کا رنگ بھی۔ یہ وہ خوبیاں ہیں جو ولی کی غزلوں کو مقبول بناتی ہیں۔ آیئے اب ان کی غزل گوئی کی خصوصیات کا تفصیلی مطالعہ کرتے ہیں۔

4.4.1: حقیقت پسندی

دکنی غزل کی سب سے اہم خصوصیت حقیقت پسندی ہے۔ قدیم دکنی شاعروں کی طرح ولی بھی ایک حقیقت پسند شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ ہندوستانی تہذیب ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں کے ذریعے ہندوستانی ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی تہذیب و تمدن اور یہاں کے پھلوں، پھولوں، شہروں، باغوں، موسموں، پرندوں، جانوروں، دریاؤں، بہاروں، تہواروں وغیرہ کا ذکر کر کے نہ صرف یہ کہ دکنی شاعری کی روایت کی پیروی کی ہے بلکہ اردو شاعری کو اس کی بنیاد سے جوڑنے کا کام بھی کیا ہے، جو شمالی ہند کی شاعری میں 1700ء کے بعد پروان چڑھی۔

شمالی ہند کی اس وقت کی شاعری میں مرصع نگاری اور تصویر کشی کا رجحان غالب نظر آتا ہے جبکہ اس کے برعکس ولی کی شاعری میں ہمیں حقیقت پسندی کا رجحان ملتا ہے۔ چند اشعار بطور مثال دیکھیں:

کوچہء یار عین کاسی ہے　　جوگی دل وہاں کا باسی ہے

اے صنم تج جبیں اپر یہ خال　　ہندوے ہر دوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی　　تل نزک اس کے جیوں سناسی ہے

*

تیری زلفاں کے حلقے میں رہے یوں نقش رُخ روشن

کہ جیسے ہند کے بھیتر لگیں دیوے دوالی میں

*

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سے اے صنم

ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

*

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں

ٹک پاؤں کے جھانجھے کی جھنکار سنا تی جا

*

مذکورہ بالا اشعار سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ولؔی کے یہاں ہندوستانی عناصر اور مقامی ماحول کی جھلک کس طرح رچی بسی تھی۔

4.4.2 : تصوف

دکنی غزل کی دوسری اہم خصوصیت حسن وعشق کا بیان ہے۔ ولؔی ایک جمالیاتی شاعر ہیں، ان کی شاعری کے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے اکثر ناقدین نے عشق حقیقی اور عشق مجازی کا ذکر کیا ہے۔ ولؔی کے یہاں یہ دونوں تصورات ملتے ہیں۔ ہندوستان میں بے شمار صوفیائے اکرام گزرے ہیں، خاص کر دکن میں کئی بزرگانِ دین کے نام ملتے ہیں۔ مثلاً خواجہ بندہ نواز گیسو دراز' میراں جی شمس العشاق' برہان الدین جانم اور امین الدین اعلیٰ وغیرہ۔ ان صوفیائے کرام کے علاوہ دکن کے اکثر شعرا کے یہاں تصوف کے اثرات نمایاں ہیں۔ ولؔی کا تعلق بھی چونکہ اسی سرزمین سے ہے لہذا لازمی بات ہے کہ اس کا اثر ان کی شاعری پر بھی پڑا۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں تصوف کا اثر اس وجہ سے بھی نظر آتا ہے کہ انھوں نے جس زمانہ میں آنکھ کھولی، وہ انتشار کا دور تھا۔ وہ بادشاہ جو کہ علم وادب کی سرپرستی دل کھول کر کیا کرتے تھے، ولؔی نے انھیں لاچار، مجبور اور قید ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایک طرف مغلوں کے حملے دیکھے تو دوسری طرف مرہٹوں کو لوٹ مار کر کے خزانوں کو لوٹتے دیکھا۔ یہی وہ حالات تھے، جس کو ولؔی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایسے دور میں تصوف لوگوں کی پناہ گاہ اور آسودگی کا ایک واحد ذریعہ ہوتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے شعرا میں تصوف کی ایک لہر موجزن نظر آتی ہے۔ ولؔی کے یہاں تصوف کا رنگ نظر آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ولی کا تعلق احمد آباد (گجرات) سے رہا ہے، وہاں بھی کئی ایک اہم بزرگ گزرے ہیں۔ احمد آباد کے مشہور صوفی شاہ نورالدین سے ولؔی درسِ سلوک لیا کرتے تھے، جو سہروردی سلسلے کے ایک مشہور بزرگ تھے۔ اسکے علاوہ ولؔی شاہ گلشن کو بھی اپنا اُستاد مانتے تھے جو خود ایک صوفی بزرگ تھے۔ اس طرح ولؔی کے یہاں تصوف کے عناصر کا آنا لازمی بات تھی۔ انھوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ تصوف کے معاملات یعنی توحید، عشق رسولؐ، فقر، قناعت، قلندری، درویشی وغیرہ کا ذکر واضح طور پر کیا ہے:

الٰہی! رکھ مجھے تو خاک پا اہلِ معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

*

شراب شوق سوں سرشار ہیں ہم
کبھو بے خود کبھو ہشیار ہیں ہم

*

ہر ایک سوں متواضع ہو سروری یہ ہے
سنبھال کشتی دل کو قلندری یہ ہے
نکال خاطر فاتر سوں جام جم کا خیال
صفا کر آئنہ دل کا سکندری یہ ہے

*

اسباب سوں دنیا کے بے غرض ہوں سدا میں
بن تیل ہور بتی ہے روشن چراغ میرا

*

مجھ دل کے آچمن میں کر یک نظر تماشا
داغاں کے ہے گلاں سوں روشن یو باغ میرا

*

مندرجہ بالا اشعار کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ولی نے تصوف کے وسیلے سے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور بنیادی انسانی مسائل کو اپنے مخصوص صوفیانہ نقطۂ نظر سے سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں فلسفیانہ و مفکرانہ انداز نہیں ملتا بلکہ زندگی کے معاملات کو جذبے اور وجدان کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش ملتی ہے، جس کی وجہ سے ان کی شاعری میں نیا رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے، جو ان کی شاعری کی اہم خوبی ہے۔

4.4.3 حسن و عشق کا بیان

ولی نے جہاں صوفیانہ رموز کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے، وہیں ان کی شاعری میں حسن و عشق کا ذکر بھی ملتا

ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ولؔی کے کلام میں زیادہ تر حسن وعشق کے موضوعات ہی ملتے ہیں، جو غزل کا بنیادی موضوع ہے۔ محبوب کے حسن وادا کی تعریف، محبوب کا سراپا یعنی چہرہ، رخسار، لب، زلفیں، آنکھیں وغیرہ کا ذکر ان کے یہاں بار بار ملتا ہے۔ ان موضوعات میں تکرار کے باوجود ان کی باتیں قاری پر گراں نہیں گزرتیں بلکہ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ انھوں نے عشق کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے۔ عشق چاہے وہ کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو، ان کی نگاہ میں اس کو اولیت حاصل ہے اور انسان کی نجات کا ذریعہ بھی یہی عشق ہی ہے، حقیقی اور مجازی کی بات بعد میں آتی ہے۔ اولیت عشق کو حاصل ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

شغل بہتر ہے عشق بازی کا
کیا حقیقی و کیا مجازی کا

*

ولؔی اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ عشق مجازی ہے۔ اس لیے وہ بار بار عشق مجازی پر زور دیتے ہیں اور اس کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

درحقیقت جن نے قدم رکھا ہے
اول قدم ہے اس کا عشقِ مجاز کرنا

*

تواضع خاکساری ہے ہماری سرفرازی ہے
حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے

*

ولؔی جو عشق بازی میں حقیقت سوں نہیں واقف
سخن اس کا قیامت میں گلِ باغ ندامت ہے

ولؔی چوں کہ عشق کے دلدادہ ہیں لہٰذا اُن کی غزلوں میں زیادہ تر موضوعات حسن وعشق سے متعلق ہی نظر آتے ہیں۔ انھوں نے عشق کے میدان میں نہ صرف قدم رکھا بلکہ اسے اپنے طور پر سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا محبوب بھی خیالی یا تصوراتی نہیں ہے بلکہ وہ اسی دنیا کا جیتا جاگتا پیکر ہے۔ انھوں نے اپنے محبوب کو مبہم نہیں رکھا ہے بلکہ اسے: نازنین، مہ جبیں، موہن، سری جن، پری، پیا، سجن، دِلربا وغیرہ جیسے ناموں سے یاد کیا ہے۔ چند اشعار بطور

مثال دیکھیے:

دل کو لگتی ہے دِلرُبا کی ادا　　جی میں بستی ہے خوش ادا کی ادا

*

دل کوں گر مرتبہ سو درپن کا　　مفت ہے دیکھنا سری جن کا

*

ولی وصل جدائی سوں سجن کی　　کبھو صحرا، کبھو گلزار ہیں ہم

طالب نہیں مہر و مشتری کا　　دیوانہ ہوا جو تجھ پری کا

*

اگر موہن کرم سوں اس طرف آوے تو کیا ہووے

ادا سوں اس قد نازک کوں دکھلاوے تو کیا ہووے

ولی جمال پرست شاعر ہیں، وہ اپنے محبوب کی تعریف طرح طرح سے کرتے ہیں۔ وہ اپنے محبوب کا سراپا بڑے موثر انداز سے بیان کرتے ہیں۔ دراصل غزل کا بنیادی موضوع محبوب کی تعریف کرنا ہے انھوں نے اپنے محبوب کی تعریف میں اس کے اعضائے جسمانی کی تعریف کے علاوہ اس کی نظروں اور راداؤں کی تعریف بھی نئے نئے انداز سے کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کو اُردو شاعری میں ایک بڑا سراپا نگار بھی مانا جاتا ہے۔

قد ترا رشک سرو رعنا ہے

معنی ناز کی سراپا ہے

*

دیکھا ہے جن نے تیرے رخسار کا تماشا

نیں دیکھتا سُرج کی جھل کار کا تماشا

اوپر پیش کی گئی مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ولی نے محبوب کے سراپے کی کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے، اس کے قد کا بیان ہو یا اس کی زلفوں کا، رخسار کی تعریف ہو یا پھر اس کے پاؤں اور جھانجھوں کی جھنکار کا، سب کے بیان کر

نے کا انداز ایسا انوکھا ہے کہ بار بار انہیں باتوں کو دہرانے کے باوجود بھی ان کی یہ باتیں بارِ خاطر نہیں گزرتیں۔ بلکہ ایک عجیب سا لطف دیتی ہیں۔ اکثر شاعری میں سراپا نگاری کے بیان میں ابتذال کی گنجائش رہتی ہے لیکن ولی کا کلام اس سے یکسر پاک نظر آتا ہے۔ انھوں نے محبوب کے سراپا کے بیان میں احتیاط ملحوظ رکھا ہے۔ ولی کی شاعری کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی لکھتے ہیں۔

''ولی نے حسن نسوانی کے بیان میں کہیں بھی ابتذال کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس بیان میں لذت پسندی اور لطف اندوزی کا خیال ضرور موجود ہے لیکن تعیش پسندی سے اس کا کوئی تعلق نہیں''۔

(ولی اورنگ آبادی، ادارۂ ادب وتنقید، لاہور، 1981ء، ص۔ 155)

ترے دو نین جب دیکھوں نظر بھر
مجھے تب نرگستان یاد آوے

*

اس رات اندھاری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پاؤں کے جھانجھے کی جھنکار سناتی جا

ولی کے کلام کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سوز و گداز اور غم واندوہ کی کیفیت نہیں ملتی بلکہ اس کے برعکس ان کے یہاں مسرت وانبساط کا احساس ملتا ہے لیکن ان کی اس نشاطیہ کیفیت میں توازن اور صحت مندی کی ایک لہر موجزن نظر آتی ہے۔ یعنی وہ صرف دروں بیں نہیں بلکہ ظاہر پرست بھی تھے، انھوں نے نہ صرف قلبی واردات کا ذکر کیا ہے بلکہ زندگی اور کائنات کو عام زاویہء نگاہ سے بھی دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں کسی حسین وجمیل چہرے کے ساتھ مناظر فطرت کی عکاسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے ایک جگہ ان کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ولی کا امتیاز خاص ہے کہ وہ ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کی غزل بلکہ سارے کلام کو پڑھ کر غم کی کیفیت پیدا ہونے کی بجائے طبیعت پر شگفتگی طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے عاشقانہ اشعار میں جذب وسرور اور شوق ونشاط کی لہر دوڑ رہی ہے۔''

(ولی سے اقبال تک، چمن بک ڈپو، اُردو بازار، دہلی، ص۔ 14)

4.4.4 زبان و بیان

ولی کی غزلوں کی ایک اہم خصوصیت اس کی زبان ہے۔ ولی کا تعلق چوں کہ شمالی و جنوبی ہند دونوں جگہوں سے رہا ہے، اسی لیے دونوں جگہوں کی زبان کی خصوصیات ان کے کلام میں در آئی ہیں۔ انھوں نے فارسی و عربی الفاظ اور ترکیبوں کو مقامی بولیوں کے الفاظ کے ساتھ ملا کر اس طرح استعمال کیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ یہ الفاظ ایک دوسرے کے لیے ہی بنائے گئے تھے۔ یعنی ان سے کسی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا اور ان ترکیبوں کا استعمال وہ اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اس میں موسیقیت اور غنائی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً

نرگستاں کوں دیکھنے مت جا — دیکھ اس نرگسی قبا کے نین
ہر تار زلف کی ترے سیر جا کروں — باد صبا کا ساتھ لیا ہوں چمن میں جا
اے ولی درد سر کی دارو ہے — مجھ کوں اس صندلی قبا کی ادا

4.4.4.1 تشبیہ و استعارہ

ولی کے کلام میں تشبیہات و استعارات کا حسن بھی نظر آتا ہے۔ ولی نے مروجہ تشبیہات کے عمدہ استعمال کے ساتھ ساتھ نئی تشبیہات بھی وضع کی ہیں۔ تشبیہات و استعارات کے استعمال کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ وہ ان تشبیہات و استعارات کا استعمال اس خوبی سے کرتے ہیں کہ اشعار میں جان پڑ جاتی ہے اور ان کی تشبیہیں بولتی ہوئی نظر آنے لگتی ہیں۔ وہ جس چیز کا بیان کرتے ہیں، اس کی تصویر نگاہوں میں رقص کرنے لگتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہر پلک عاشقوں کے جی کے تئیں
کاٹنے کوں بس ایک آرا ہے

*

کان کے در کی کیا کروں تعریف
پہلوئے ماہ جیوں ستارا ہے

*

موج دریا کو دیکھنے مت جا
دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

*

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر

ناگنی جیوں کنویں پہ پیاسی ہے

*

اے گل باغ حسن مکھ سوں ترے

جلوہ پیرا ہے رنگ و بوئے حیا

*

ولی کی بیشتر غزلوں میں ہمیں جہاں تشبیہات اور استعارات کا حسن نظر آتا ہے، وہیں گل و بلبل، چمن و باغ گلشن و بہار، غنچہ و کلی، شبنم، شراب، جام، شمع، پروانہ، چراغ وغیرہ جیسے استعارے بھی نظر آتے ہیں۔ ان استعاروں کے خوبصورت استعمال سے انھوں نے اپنی غزلوں میں جان ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ولی کی غزلوں میں تشبیہات و استعارات کے ساتھ ساتھ شعری صنعتوں کا بھی عمدہ استعمال بھی ملتا ہے۔ ان صنعتوں کا استعمال انہوں نے اس خوبی سے کیا ہے کہ ان کے اشعار کا حسن دوبالا ہو گیا ہے۔

4.4.4.2 : صنعت مبالغہ

ولی نے اپنی غزلوں کے حسن کو بڑھانے کے لیے مبالغے کا جگہ جگہ استعمال کیا ہے۔ یہ ان کا کمال ہے کہ وہ اپنے محبوب کے حسن کی تعریف اس قدر بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں کہ اس پر مبالغے کا اثر صاف ظاہر ہونے لگتا ہے لیکن ولی کی اس مبالغہ آرائی سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں زبان و بیان پر کس قدر قدرت حاصل تھی؟ اس سلسلے میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

تجھ مکھ کے آفتاب کی گرمی کوں دیکھ کر

جل شوق کی اگن سوں ہوا جیوں انگارہ دِل

*

گر مضطرب ہیں عاشق بے دل عجب نہیں

وحشی ہوئے ہیں تیری انکھاں دیکھ کر غزال

*

تیری طرف انکھیاں کوں کہاں تاب کہ دیکھیں

سورج سوں زیادہ ترے جامے کی بھڑک ہے

*

ان اشعار میں ولؔی کی شاعری میں جذبے کی فراوانی کی شدت بھی نظر آتی ہے او رزبان کا لطف بھی۔اوراس کے ساتھ ہی ساتھ زبان وبیان پران کی قدرت ومہارت کا بھی ہمیں علم ہوتا ہے۔

4.4.4.3 : صنعت مراعات النظیر

ولؔی نے اپنی غزلوں میں صنعت مراعات النظیر کا استعمال بھی بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ صنعت مراعات النظیر اس وقت قائم ہوتی ہے جب شعر کے پہلے مصرعے میں ایک بات کہی جائے اوردوسرے مصرعے میں اسی کی مناسبت سے چند الفاظ کا استعمال کیا جائے تو اسے صنعت مراعات النظیر کہتے ہیں۔ولؔی کے یہاں اکثر یہ صنعت ملتی ہے۔چند مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں،انہیں بغور دیکھیں:

زخم کرتا نہیں ہمارے حال پر

شوخ ہے،سرکش ہے، بے انصاف ہے

*

مجھ سوں کیونکر ملے گا،حیراں ہوں

شوخ ہے، بے وفا ہے،سرکش ہے

*

تغافل شوخ کا عاشق کے حق میں

ستم ہے،ظلم ہے، جور و جفا ہے

*

صنم مجھ دیدۂ ودل میں گذر کر

ہوا ہے باغ ہے،آبِ رواں ہے

مندرجہ بالا اشعار میں شاعر نے محبوب کے تغافل اور جفاکشی کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا ہے اور دوسرے مصرعے میں اسی مناسبت سے اس سے تعلق رکھنے والے الفاظ استعمال کیا ہے اس طرح اس صنعت کے ذریعہ ولؔی نے

اپنے کلام کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

4.4.3.4 : صنعت تضاد

ولی کے کلام میں ہمیں صنعت تضاد کی خوبی بھی نظر آتی ہے۔یعنی ولی نے اپنے شعر کے حسن کو دوبالا کرنے کے لیے متضاد الفاظ کا استعمال کیا ہے مثلاً:

زلف ورخ ہے ترا جو لیل ونہار
مجھ کوں واللّیل، والضّحی کی قسم

*

ولی وصل وجدائی سوں سجن کی
کبھو صحرا، کبھو گلزار ہیں ہم

4.4.3.5: صوتی آہنگ

ولی کے کلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کی تکرار سے ایسا صوتی آہنگ پیدا ہوتی ہے جو کانوں کو نہ صرف بھلا معلوم ہوتا ہے بلکہ اس سے ایک نغمگی وترنم کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔مثلاً ؎

نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے
بلائے عاشقاں ناز وادا ہے

*

تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کوں کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھیاں کو لگاتی جا

*

جب سوں وہ نازنین کی میں دیکھا ہوں چھب عجب
دل میں مرے خیال ہیں تب سوں عجب عجب

*

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں گل روسوں
خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

ان اشعار سے نہ صرف ولؔی کے کلام میں صوتی آہنگ کا علم ہوتا ہے بلکہ ایک غنائی کیفیت کا بھی لطف آتا ہے یہی وہ خصوصیات ہیں جو ولؔی کی شاعری کو دوسرے شعرا سے منفرد کرتی ہیں۔ ڈاکٹر شارب ردولوی لکھتے ہیں:

''ولؔی کے کلام میں غنائیت اور موسیقیت بہت زیادہ ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے الفاظ کی کیفیت اور ان کے صوتی اثرات کا بہت خیال رکھا ہے منفرد الفاظ کے صوتی آہنگ اور ان کے ملنے سے جو غنائیت یا موسیقیت پیدا ہوتی ہے ان سب کو نگاہ میں رکھ کر شعر کہے ہیں''۔ (مطالعہ ولؔی، ص 65)

ولؔی کے کلام کے مطالعہ کے بعد بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ولؔی نے اپنی شاعری میں شعر کے فنی محاسن یعنی صنعتوں کا بڑی عمدگی سے استعمال کیا ہے۔ مختلف تشبیہوں اور استعاروں کو اس خوبی سے شعر میں جگہ دی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ انھیں کے لیے مخصوص تھیں۔ جہاں ولؔی نے اپنی شاعری میں زبان و بیان کا کمال دکھایا ہے، وہیں غزل کے موضوعات کا بھرپور استعمال بھی کیا ہے۔ ان کے یہاں زبان و بیان کے ساتھ ساتھ موضوعات میں بھی انفرادیت دکھائی دیتی ہے ان کی شاعری میں معنویت اور طرز ادا میں رعنائی و دلکشی نظر آتی ہے۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ولؔی اردو شاعری میں منفرد لب و لہجے کے شاعر کہے جاتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4۔ ولؔی کے کلام سے صنعتِ تضاد کی مثال پیش کیجیے۔

5۔ صوتی آہنگ کی مثال ولی کے کلام سے دیجیے۔

6۔ تشبیہ کی مثال پیش کیجیے۔

4.5 : ولؔی اورنگ آبادی کی غزل

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا — جادو ہیں ترے نین غزالاں سوں کہوں گا

دی دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی — یوکشورِ ایراں میں ،سلیماں سوں کہوں گا

تعریف ترے قد کی،الف وار سری جن — جا سروِ گلستاں کوں خوش الحاں سوں کہوں گا

مجھ پر نہ کرو ظلم،تم اے لیلیٰ خوباں — مجنوں ہوں ترے غم کوں بیاباں سوں کہوں گا

دیکھا ہوں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی　　اس خواب کو جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا
جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن　　یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا
اک لفظ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا　　اس مکھ کوں ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا
قربان پری مکھ پہ ہوئی چوب سی جل کر　　یہ بات عجائب مہِ تاباں سوں کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے ولؔی اس درد سوں ہرگز　　چلتا ہوں ترا درد میں درماں سوں کہوں گا

***

4.5.1 : مجموعی تاثر

اس غزل کو پڑھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناقدین نے آج تک غزل کی جو تعریفیں بیان کی ہیں، ان پر یہ غزل پوری طرح کھری اترتی ہے۔ مثلاً غزل کا مطلب ہے حسن و عشق کی باتیں کرنا، محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرنا، عاشق کا اپنے دلی جذبات کا اظہار والہانہ طور سے کرنا وغیرہ۔ زیر بحث غزل شروع سے آخر تک انھیں کیفیات کا اظہار ہے۔ شاعر پہلے اپنے محبوب کے حسن کی طرح طرح سے تعریفیں بیان کرتا ہے۔ مثال کے طور پر محبوب کے لب، آنکھیں، اس کی قد و قامت اور خوبصورتی کی دل کھول کر بڑائی کرتا ہے اور آخر تک آتے آتے اپنا دلی مدعا بیان کرتا ہے۔ اپنا حرف مدعا بیان کرتے ہوئے اپنے دل کو خود ہی تسلی دیتا ہے کہ بے صبر نہ ہو میں تمہارا درد، تمہاری پریشانی اور دل کی لگی کو تمہارے چارہ گر یعنی محبوب سے کہوں گا اور امید ہے کہ تمہارا حال سن کر، تمہاری کیفیت جان کر وہ پری رخ تم پر ضرور مہربان ہوگا اور تمہاری تمام تر پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ غزل میں عاشق کو اپنے محبوب سے اسی طرح کی توقعات ہمیشہ ہوتی ہیں اور محبوب کا معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس غزل کے خاص نکات یہ ہیں: اس غزل میں تشبیہات اور تلمیحات کا استعمال خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ غزل میں شروع سے آخر تک ''سوں'' لفظ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کیوں کہ بیشتر اشعار میں اس کا استعمال کلیدی لفظ کے طور پر کیا گیا ہے۔ یہ غزل ہمیں میرؔ کی غزل ''ہستی اپنی حباب کی سی ہے'' کی یاد دلاتی ہے۔

4.5.2 : غزل کی تشریح

شعر نمبر 1:　　اس شعر میں لفظ 'سوں' خاص توجہ کا طالب ہے۔ کیوں کہ اس شعر میں 'سوں' ہی کلیدی لفظ ہے اور اسی سے معنوی پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ جب شاعر کہتا ہے کہ 'تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہوں گا' تو اس کا دو مطلب ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ تیرے ہونٹوں میں بدخشاں کے لعل کی سی سرخی ہے۔ دوم یہ کہ تیرے ہونٹ

بدخشاں کے لعل کی طرح ہی قیمتی ہیں۔شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب تیرے ہونٹوں میں جو خوبی ہے، اسے دیکھ کر مجھے لعل بدخشاں کی یاد آجاتی ہے۔ تیرے لبوں کو تو میں لعل بدخشاں سے ہی تعبیر کروں گا۔ تیری آنکھوں میں جو سحر ہے، جو جادو ہے، جو نشہ ہے انھیں دیکھ کر میں تو یہی کہوں گا کہ یہ ہرن کی مانند ہیں۔ان میں وہی شوخی، وہی چنچل پن ہے جو غزالوں میں ہوتی ہے۔اسی لیے میں انھیں غزالوں جیسی ہی کہوں گا۔

شعرنمبر2: اے میرے محبوب! تجھے تو اللہ نے حسن نگر کی بادشاہی عطا کی ہے(یہاں حسن نگر کی بادشاہی سے مراد خوبصورتی سے ہے)۔یعنی شہرِ حسن کی تم ملکۂ حسن ہو اور یہ بھی کہ ایران جیسے ملک میں تمھارے جیسا خوب رو کوئی نہیں ہے۔ یہ بات میں سلیمانؑ سے کہوں گا۔اس شعر میں تلمیح ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ اس روئے زمین پر آج تک سلیمانؑ سے زیادہ بادشاہت کسی کو نصیب نہیں ہوئی ہے۔کیوں کہ سلیمانؑ کی بادشاہت تمام مخلوقات پر تھی۔لیکن شاعر کا یہ کہنا کہ میں سلیمانؑ سے جا کر کہوں گا سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ عاشق کے نزدیک اس کے محبوب کی بادشاہت زیادہ عمدہ اور حسین ہے اور وہ یہ دعویٰ سلیمانؑ سے جا کر کرنا چاہتا ہے کہ آپ کی حکمرانی خواہ کیسی ہی ہو پر میرے محبوب کی بادشاہت آپ سے بڑھ کر ہے۔ظاہر ہے کہ یہاں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اور شاعری میں مبالغہ خوبی تسلیم کیا جاتا ہے، خامی نہیں۔

شعرنمبر3: شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب کا قد الف کی طرح بالا ہے۔ یہ بات میں گلستاں میں جا کر سرو سے نہایت میٹھے لہجے میں کہوں گا۔ یہاں اس شعر میں شاعر کے نزدیک، کہیں نہ کہیں اس کے ذہن میں، یہ بات ضرور پوشیدہ ہے کہ میرے محبوب کا قد سرو سے کہیں بڑھ کر ہے، تبھی تو وہ یہ دعویٰ کر رہا ہے۔

شعرنمبر4: اس شعر میں بھی شاعر نے تلمیح کا استعمال کیا ہے۔اے میرے پیارے محبوب! تم مجھ پر یوں ظلم نہ کرو ورنہ میں تمھارے ظلم کی روداد صحرا سے کہوں گا۔اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم مجھ پر چاہے جتنا ظلم کرو مگر میں یہ بات کسی سے نہیں کہوں گا کیوں کہ ایسا کرنے سے نہ صرف میرے محبوب کی بدنامی ہوگی بلکہ اس کی بدنامی سے میری بھی بدنامی ہوگی۔اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ میں جنگل میں تمھارے ظلم کی داستان تمام مخلوقات سے بتادوں گا۔جس سے تمھاری رسوائی ہو جائے گی۔لہٰذا مجھ پر ظلم نہ کرو۔ یہاں ظلم نہ کرنے سے مراد یہ ہے کہ مجھ پر نظر کرم کیجیے، کیوں کہ آپ جیسے خوبیوں والے انسان کو ظلم کرنا زیب نہیں دیتا۔

شعرنمبر5: اے خوبیوں کی ملکہ! میں نے تجھے خواب میں دیکھا ہے اور اپنے اس خواب کو میں کنعان جا کر یوسفؑ سے کہوں گا۔یاد رہے کہ یوسفؑ کنعان کے رہنے والے تھے۔ کہتے ہیں کہ آج تک اس روئے

زمین پر ان سے بڑھ کر خوبصورتی اللہ نے کسی کو نہیں عطا کی۔ لیکن یہاں عاشق کے یوسفؑ سے اپنے خواب کو بتانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک اس کا محبوب زیادہ حسین ہے۔ یہ ایک عام فلسفہ ہے کہ جس کے دل کو کوئی بھا جاتا ہے، اس کی نگاہوں میں وہی سب سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔ اب اس شعر کے مفہوم کو ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ عاشق اپنے محبوب کی خوبصورتی کو دنیا کے سامنے ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس کا محبوب ایسا ہے کہ اس کی خوبصورتی کا ثانی ڈھونڈنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

شعر نمبر 6: ابھی تک شاعر اپنے محبوب کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا تھا لیکن اس شعر میں اس نے اپنا اصل مدعا بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتا ہے، اے ساجن! میں تیری قربت پانے کے غم میں، بس تیری ایک نظرِ کرم کی امید میں، رات و دن جل رہا ہوں، ایسے میں میرا حال ایسا ہی ہے، جیسے کہ کوئی آگ سے جلا ہوا ہو۔ آگ سے جلنے پر جو تکلیف ہوتی ہے، ٹھیک اسی طرح تیرے غم میں، میں جل رہا ہوں۔ اس لیے مجھے اس شدید تکلیف سے نجات دلا دے، کیوں کہ میرے اس دکھ کا مداوا صرف تیرے ہی پاس ہے، اس لیے میری فریاد سن لے اور خدا کے واسطے مجھ پر عنایت کی نظر کر دے۔

شعر نمبر 7: تیرے مکھڑے کے ایک ایک نقش و نگار کو قدرت نے اتنی خوبی سے بنایا ہے کہ اس میں کہیں سے بھی کسی طرح کی کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ اس لیے میں تیرے مکھڑے کو قرآن کے صفحے کے مانند کہوں گا۔ قرآن کے صفحے سے تشبیہ دینے سے یہ مراد ہے کہ جس طرح قرآن میں کوئی کمی نہیں ہے اور وہ ہر طرح سے مکمل اور جامع ہے، بالکل اسی طرح تیرے مکھڑے کا بھی حال ہے کہ اس میں کہیں بھی ذرہ برابر کمی نہیں ہے۔

شعر نمبر 8: میرے محبوب کے حسن کو دیکھ کر چاندنی جل کر خاک ہوگئی یا چوب سی ہوگئی ہے، یہ تعجب خیز واقعہ میں مہِ تاباں سے کہوں گا۔ مہِ تاباں سے مراد چاند کی چودھویں رات سے ہے، جب چاند اپنے شباب پر ہوتا ہے۔ اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ محبوب کے چہرے میں جو تابناکی ہے، وہ چاندنی سے کہیں بڑھ کر ہے، جسے دیکھ کر چاندنی جل اٹھی ہے۔ اس شعر کو پڑھتے ہی رازؔ الہ آبادی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے:

تیرا چہرہ کتنا سہانا لگتا ہے
تیرے آگے چاند پرانا لگتا ہے

اب شعر کا مطلب یہ ٹھہرا کہ محبوب کے چہرے کی جاذبیت چاند اور چاندنی سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اسی لیے تو شاعر چاند سے کہنے کی جرأت کر رہا ہے۔

شعر نمبر 9: شاعر اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ اے ولیؔ! اس درد کے واسطے تو حیران نہ ہو، میں ابھی جاتا ہوں اور تیرے محبوب سے تیرا حال بیان کرتا ہوں۔ جس کے غم میں تو اس قدر آہیں بھر رہا ہے، جب اس کو تمھارے حال کی خبر ہوگی تو وہ ضرور تم پر نظرِ عنایت کرے گا اور پھر تمھارے درد کا مداوا ہو جائے گا۔ اردو غزل کا ہمیشہ سے یہی مزاج رہا ہے کہ عاشق اپنے محبوب سے مثبت امیدیں رکھتا ہے لیکن محبوب کی طرف سے ہمیشہ ہی منفی ردِ عمل سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی عاشق کو اپنے درد کے مداوے کے لیے اپنے محبوب سے مثبت امید ہے اور یہی غزل کا مزاج ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7۔ تلمیح سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ مثال کے ساتھ بتائیے۔

8۔ تکرار لفظی کی مثال ولیؔ کے کلام سے پیش کیجیے۔

4.6: دوسری غزل، متن

کوچہ ٔ یار عین کاسی ہے — جوگیِ دل وہاں کا باسی ہے

پی کے بیراگ کی اداسی سوں — دل پہ میرے سدا اُداسی ہے

اے صنم! تجھ جبیں اُپر یہ خال — ہندوئے ہردوار باسی ہے

زلف تیری ہے موج جمنا کی — تل نزک اُس کے جیوں سناسی ہے

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنویں پہ پیاسی ہے

جس کی گفتار میں نہیں ہے مزہ — سخن اُس کا طعامِ باسی ہے

اے ولیؔ! جو لباس تن پہ رکھا — عاشقاں کے نزک لباسی ہے

***

4.6.1 مجموعی تاثر

اس غزل میں ولیؔ نے اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف مختلف طریقوں سے کرنے کی کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں، سب سے پہلے وہ اپنے محبوب کی گلی کی تعریف کرتے ہیں۔ چوں کہ شاعر نے اپنے محبوب کی گلی کو کاشی کی گلی کے مترادف قرار دیا ہے، اسی لیے آگے بھی وہی ترکیبیں استعمال کی ہیں، جس سے سنیاسیوں اور جوگیوں کو خاص لگاؤ ہوتا ہے۔ ولیؔ کے عہد کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے بڑی بے باکی سے ہندو بھگتی تحریک کی

اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔محبوب کے رخسار،اس کی زلفیں اور ٹھوڑی پر قائم تل کی مختلف زاویوں سے تعریف کرتے ہوئے اس کو کبھی جمنا کی موج تو کبھی ناگن سے تشبیہ دینے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی شاعری کی بھی تعریف کرنے کی سعی کی ہے اور کہا ہے کہ جس کی شاعری میں لطف نہیں ہے وہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے کہ طعام باسی ہو۔محبوب جو بھی لباس زیب تن کرتا ہے،اس پر وہ خوب پھبتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا ہر لباس عاشقوں کے دل کو خوب بھاتا ہے۔پوری غزل عشقِ مجازی کے مضمون پر مبنی ہے لیکن ولی کا اپنا ایک مقام ہے،وہ اس سے فروتر کوئی بات نہیں کہتے۔ان کی اس غزل میں تشبیہ کا استعمال خوب کیا گیا ہے یا پھر ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ پوری غزل میں تشبیہ نے ایک خاص شان اور رنگ پیدا کر دیا ہے۔ایک اور خاص بات اس غزل کی یہ ہے کہ اس میں ہندو بھکتی تحریک کی ترکیبیں خوب استعمال کی گئی ہیں،جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر بھکتی تحریک سے کافی متاثر ہے۔یہی سبب ہے کہ ''کاسی''، ''جوگی''، ''بیراگ''، ''ہردوار'' اور ''سنیاسی'' جیسی ترکیبیں استعمال کر غزل کو ایک آہنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے ایک وحدتِ تاثر قائم ہوتا ہے۔

4.6.2 تشریح

شعرنمبر1: ولی نے محبوب کی گلی کو کاشی کی گلی سے تشبیہ دے کر اپنے محبوب کی گلی کے مرتبے کو بلند کر دیا ہے یعنی اس کے محبوب کی گلی کوئی ایسی ویسی گلی نہیں بلکہ کاشی کی پاک اور مقدس گلی کی مانند ہے اور اس کا دل اس مقدس گلی کا باشندہ ہے۔چوں کہ شاعر نے کوچہء یار کو کاشی کی گلی کے مانند کہا ہے اسی لیے اس کی مناسبت سے اگلے مصرعے میں لفظ جوگی کا استعمال کیا ہے اور اپنے دل کو جوگی کا دل کہا ہے۔جوگی کو ہر گھڑی کاشی کی گلی کی یاد آتی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ کاش اسے اس گلی میں رہنے کا موقع نصیب ہوتا تو وہ جی بھر کے اپنی بھکتی کر لیتا۔ٹھیک وہی حال عاشق کا بھی ہے وہ بھی وہی چاہتا ہے،اس کی بھی وہی خواہشات ہیں جیسے کہ ایک جوگی کی ہوتی ہیں۔یعنی اس کا دل کہیں اور نہیں لگتا وہ ہر گھڑی وہیں رہتا ہے۔اسی لیے ولی نے محبوب کی گلی کو کاشی کی گلی سے تشبیہ دی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح کاشی کی گلیاں جوگیوں کے لیے مقدس ہوتی ہیں اور وہ اس سے عقیدت رکھتے ہیں ٹھیک اسی طرح میں بھی محبوب کی گلی کو مقدس مانتا ہوں اور اس سے عقیدت رکھتا ہوں۔

شعرنمبر2: جس طرح اور جیسے جوگی کو بیراگ پر جانا پڑتا ہے، جہاں وہ اس دنیا سے دور،سنسان جنگل میں اپنی عبادت میں مشغول رہتا ہے اور اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں رہتی۔ٹھیک اسی طرح،شاعر کہتا ہے کہ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے بھی جوگیوں ہی کی مانند بیراگ لے رکھا ہے،جس کے سبب میرے بھی دل پر ہر گھڑی اداسی سی چھائی رہتی

ہے۔اس شعر میں لفظ ''سوں'' ایک خاص نکتے کی طرف اشارہ کر رہا ہے، جس سے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ عاشق کو سوائے محبوب کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا ہے اور چوں کہ محبوب کا قرب اسے نصیب نہیں ہو پا رہا ہے، اس لیے اس کے دل پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور اسے اپنی زندگی جوگیوں کے بیراگ کی مانند نظر آ رہی ہے۔

شعر نمبر 3: شاعر کہتا ہے کہ اے میرے محبوب! تیری پیشانی کے اوپر یہ تل مجھے ہندوئے ہردوار باسی کی مانند لگ رہا ہے۔ ہندو مذہب کے مطابق ہندوستان میں ان کے چار مقدس مقامات ہیں۔ الہ آباد، ہردوار، اجین اور کانچی پورم۔ ان جگہوں کے رہنے والے اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ یہاں جسے رہنے کا موقع مل گیا، گویا اس کی زندگی سنور گئی اور اس کے جینے کا مقصد پورا ہو گیا۔ اسی طرح تل کو تمہاری پیشانی پر رہنے کی جو سعادت نصیب ہوئی ہے، اس سے، اس کے بھی بھاگ اسی طرح سنور گئے ہیں، جیسے کہ ہندوئے ہردوار باسی کے۔

شعر نمبر 4: اس شعر کے پہلے مصرعے میں استعارہ اور دوسرے مصرعے میں تشبیہ ہے۔ محبوب کی زلف کو جمنا کی موج کہنے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح جمنا کی موجوں میں لہروں کا اتار چڑھاؤ ہے، اسی طرح محبوب کی زلفوں میں بھی مد و جزر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر اپنے محبوب کے زلفِ پیچاں کی تعریف کر رہا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ اس نے زلفوں کو جمنا کی موج کہا ہے، اسی لیے پیشانی کے تل کو، جو کہ زلفوں کے بالکل قریب ہی ہے اسے سنیاسی کہا ہے۔ اب ہمیں جوگیوں اور سنیاسیوں کے بارے میں یہ جان لینا چاہیے کہ شاعر نے ایسا کیوں کہا؟ عام اصول ہے کہ جب جوگی یا سنیاسی اپنی دھونی رماتے ہیں تو وہ کسی دریا کے کنارے ہی بیٹھتے ہیں۔ اسی لیے شاعر کو ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی جوگی جمنا کے کنارے بیٹھ کر دھونی رما رہا ہو۔

شعر نمبر 5: اس غزل کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاعر کا جی اپنے محبوب کی تعریفیں کرتے نہیں تھک رہا ہے۔ شاید اسی لیے وہ بار بار اس کے زلف و رخسار کی طرح طرح سے تعریف کر رہا ہے۔ محبوب کی کالی کالی زلفیں جو کہ اس کی ٹھوڑی پر آئی ہوئی ہیں، انھیں دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے کہ کوئی ناگن کنویں پر پیاسی بیٹھی ہو۔ یہاں بھی تشبیہ سے کام لے کر شاعر نے شعر میں حسن اور جاذبیت پیدا کر دی ہے۔

شعر نمبر 6: وہ شخص جس کی گفتگو میں لطف نہیں ہے یا جس کی بات پر لطف نہیں ہے، اس کا کلام باسی کھانے کی طرح بے مزہ ہے۔ یعنی شعر میں جب تک کوئی نئی بات، کوئی نیا نکتہ نہیں ہوگا، وہ بھی طعامِ باسی کی مانند ہی بے مزہ رہے گا۔

شعر نمبر 7: اس شعر کو پڑھتے ہی حسرتؔ موہانی کا ایک شعر یاد آتا ہے:

اللہ رے جسمِ یار کی خوبی کہ خود بہ خود

رنگینیوں میں ڈوب گیا پیرہن تمام

ولؔی کہتے ہیں کہ محبوب نے جو بھی لباس زیب تن کیا، عاشقوں کے نزدیک وہی اس پر خوب کھلتا ہے، جس کے باعث عاشق اس کے ذوق کے قائل ہو گئے ہیں یا پھر یہ کہ سارا زمانہ اس کا قائل ہو گیا ہے۔ یہاں عاشق اپنے محبوب کے ذوق وشوق کی داد دینا چاہتا ہے اور یہ پیغام دینا چاہتا ہے کہ ذوق ہو تو ایسا ہو کہ جو دیکھے وہ قائل ہو جائے۔

4.7 خلاصہ

اس اکائی میں ہم نے ولؔی کی زندگی، حیات، مزاج اور ان کی شاعری کی خصوصیات پر اجمالاً نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے، جس سے آپ کو ان کی حیات اور شاعری کا خاطر خواہ علم یقیناً ہو گیا ہوگا۔ اس کے علاوہ انہوں نے شمال اور جنوب کو ملانے کا جو گراں قدر کام انجام دیا ہے اور جس کا اثر ان کی زبان پر بھی دکھائی دیتا ہے، اس سے بھی آپ کو واقف کرانے کی کوشش اس اکائی میں کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ ولؔی کی شخصیت، شاعری اور اس کی خصوصیات سے نہ صرف آگاہ ہو سکیں گے بلکہ خود بھی ان کی شاعری اور شخصیت پر مختصراً اظہار خیال کر سکیں گے۔ ان کی دو غزلوں کے مطالعے، مجموعی تاثر اور ان کی تشریح کے مطالعے سے بھی آپ کو ولؔی کی شاعری، شخصیت اور فن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ اکائی کے آخر میں فرہنگ اور کتابیات کے علاوہ اپنے مطالعے کی جانچ کے سبھی سوالوں کے جوابات بھی دیے گئے ہیں۔ کتابیات سے آپ کو مزید مطالعے میں ضرور مدد اور رہنمائی فراہم ہو سکے گی امید ہے کہ آپ اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔

4.8 : فرہنگ

جلوہ پیرا	ظاہر ہونا، ایک خاص طرز سے اپنے تئیں بن سنور کے ظاہر ہونا۔
جھانجھے	پائل، ایک قسم کا پاؤں کا آواز دار زیور
جیوں	جیسے
خاک پا	پاؤں کے نیچے کی مٹی، نہایت حقیر، مسکین
درپن	آئینہ

زنخداں	تھوڑی
مکھ	چہرہ، منہ
سوں	سے
غم واندوہ	فکر وتردد، رنج
سراپا	سرتاپا، سر سے پاؤں تک
سرج	سورج
صحت مند	تندرست، درست
نشاطیہ کیفیت	خوشی یا شادمانی کی حالت
توازن	برابری، ہم وزن
کیف وسرور	نشہ، خوشی
سرخوشی	مسرت، شراب کا سرور
مناظر فطرت	قدرتی نظارے
تلمیح	کلام میں کسی تاریخی قصے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔

4.9 : معاون کتابیں

کلیات ولی : نورالحسن ہاشمی

مطالعہ ولی : ڈاکٹر شارب ردولوی

اردو غزل ولی تک : ڈاکٹر سید ظہیرالدین مدنی

دکنی غزل کی نشونما : ڈاکٹر محمد علی اثر

دکن میں اردو : نصیرالدین ہاشمی

4.10 : نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے۔

1) ولؔی کی سوانح وشخصیت کے بارے میں اپنی واقفیت سے آگاہ کیجیے۔

2) ولؔی کی عشقیہ شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیجیے۔

3) ولؔی کی غزلوں کی خصوصیات کے تعلق سے اپنی معلومات کا اظہار کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے۔

1) ولؔی کا تعلق اورنگ آباد سے ہے یا گجرات سے، اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

2) اردو شعرا کے کلام میں ولؔی کے اثرات کی نشاندہی کیجیے۔

4.11 اپنی معلومات کی جانچ: نمونۂ جوابات

1۔ ولؔی اورنگ آبادی کا پورا نام ولی محمد تھا۔

2۔ ولؔی اورنگ آباد میں پیدا ہوئے تھے۔

3۔ ولؔی شاہ وجیہ الدین کی خانقاہ میں شاہ نورالدین سہروردی کے مرید بنے تھے۔

4۔ تج مکھ کے آفتاب کی گرمی کوں دیکھ کر جل شوق کی اگن سوں ہوا جیوں انگارہ دل

5۔ نہ وہ بالا نہ وہ بالی بلا ہے بلائے عاشقاں ناز وادا ہے

6۔ تشبیہ کے اصل معنی ہیں ایک چیز کو دوسری کے مانند ٹھہرانا۔ یہ شعر میں اس وقت قائم ہوتی ہے جب شاعر کسی چیز کو دوسری چیز سے مشابہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً:

کان کے در کی کیا کروں تعریف پہلوئے ماہ جیوں ستارہ ہے

7۔ کلام میں کسی تاریخی قصے یا واقعے کی طرف اشارہ کرنے کو تلمیح کہتے ہیں۔ جیسے:

دی بادشہی حق نے تجھے حسن نگر کی یو کشورِ ایراں میں، سلیماں سوں کہوں گا

8۔ عجب کچھ لطف رکھتا ہے خلوت میں گل روسوں

خطاب آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

بلاک نمبر-2

غزل

اکائی ۵۔جگرؔ مرادآبادی

اکائی ۶۔مجروحؔ سلطانپوری

اکائی ۷۔عزیزؔ لکھنوی

درج بالا بلاک تین اکائیوں پر مشتمل ہے۔ بلاک کی پہلی اکائی جگرؔ مرادآبادی کی حیات اور شاعری سے تعلق رکھتی ہے۔اس اکائی میں جگرؔ صاحب کے حالاتِ زندگی، شخصیت، فن، شاعرانہ اہمیت اور ان کی شعری خصوصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی دو غزلیں بھی مع تشریح کے شامل کی گئی ہیں۔دوسری اکائی اردو کے مشہور غزل گو اور فلمی نغمہ نگار مجروحؔ سلطانپوری کی شاعرانہ خصوصیات کے تفصیلی جائزے پر مبنی ہے۔جس کے مطالعے سے آپ مجروحؔ سطانپوری کی زندگی کے مختصر حالات، ان کی غزل گوئی کی اہم اور نمایاں خصوصیات اور شامل نصاب دو غزلوں کے مفہوم اور ان کے ادبی و فنی نیز شعری محاسن سے واقفیت حاصل کریں گے۔تیسری اکائی میں دبستانِ لکھنؤ کے اہم ترین شاعر عزیزؔ لکھنوی کی شاعرانہ خوبیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس اکائی کے مطالعے سے آپ دبستانِ لکھنؤ کی شعری خصوصیات سے بھی بالواسطہ طور پر واقف ہو جائیں گے ۔عزیزؔ لکھنوی کی دو غزلوں کو بھی اس اکائی میں شامل کیا گیا ہے۔جس کی تشریح اور مشکل الفاظ کے معنی بھی درج کیے گئے ہیں تا کہ آپ اس کو با آسانی سمجھ سکیں۔ہم امید کرتے ہیں کہ ان اکائیوں کا مطالعہ اردو غزل گوئی کے بارے میں آپ کی معلومات میں بیش بہا اضافہ کرگا۔

اکائی 5 : جگرؔ مرادآبادی

ساخت

7.1 اغراض ومقاصد

7.2 تمہید

7.3 حیات

7.4 جگرؔ کی شاعرانہ خصوصیات

7.4.1 جگرؔ کا تصورِ عشق

7.4.2 جگرؔ کا تصورِ محبوب

7.4.3 جگرؔ اور تصوف

7.5 جگرؔ کی غزل (1)

7.5.1 غزل کی تشریح

7.6 جگرؔ کی غزل (2)

7.6.1 غزل کی تشریح

7.7 خلاصہ

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

7.9 فرہنگ

7.10 معاون کتابیں

7.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

7.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ جگر مرادآبادی کے حالاتِ زندگی، شخصیت، فن، شاعرانہ اہمیت اور ان کی شعری خصوصیات کا مطالعہ کریں گے۔ زیرِنظر اکائی میں جگر کی دو غزلیں بھی شامل ہیں، جن کی تشریح سے آپ واقف ہوجائیں گے۔ ان غزلوں کے مطالعہ سے آپ کو جگر کے کلام کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

7.2 تمہید

جگر مرادآبادی اردو کے بے حد مقبول اور مشہور شاعر ہیں۔ ان کی شاعری اپنے عہد کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری اور آواز سے غزل کو ایک نئی زندگی دی اور اسے خواص وعوام میں مقبول بنایا۔ وہ اپنے زمانے کی آواز رہے ہیں۔ انہیں اردو شاعری میں جو مقبولیت ملی وہ کم لوگوں کو ملتی ہے۔ ان کے عہد کے تمام ناقدین نے ان کو ایک بڑا شاعر تسلیم کیا ہے۔

7.3 حیات

جگر مرادآبادی کا اصل نام علی سکندر اور تخلص جگر تھا۔ وہ 1890ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد کا تعلق مولویوں کے خاندان سے تھا اور ان کے جد اعلیٰ مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے اتالیق کے منصب جلیلہ پر فائز رہ چکے تھے۔ نسبی اعتبار سے شیخ صدیقی تھے اور سلسلہ نسب 36 واسطوں سے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا تھا۔ چھ ماہ کی عمر میں جگر کے والد محمد علی نظر صاحب انہیں لے کر مرادآباد چلے آئے۔ ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہوئی۔ رواج زمانہ کے مطابق جگر کو بھی اُردو، فارسی اور عربی زبانوں کی تعلیم دی گئی۔ قرآن شریف مولانا محمد صدیق سے پڑھا جو مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے بزرگ کے خلیفہ تھے۔ اس کے بعد انگریزی تعلیم کا آغاز ہوا۔ کروی (ضلع باندہ) اور لکھنؤ میں اُنہوں نے انگریزی کی تعلیم حاصل کی اور نویں جماعت تک انگریزی پڑھی۔ مگر اس کے بعد تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا۔ کچھ دن باندہ میں اپنے چچا علی ظفر کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔

جگرؔ نے تین شادیاں کیں۔ان کی پہلی بیوی وحیدہ بیگم تھیں جن کا دو برس بعد انتقال ہو گیا۔اس کے بعد اصغرؔ گونڈوی کی سالی نسیم بیگم سے جگرؔ کی شادی ہوئی لیکن جگرؔ کی شراب نوشی اور دوسرے عوامل کی وجہ سے نسیم بیگم نے طلاق لے کر اصغرؔ گونڈوی سے شادی کر لی۔اصغرؔ کے انتقال تک جگرؔ شراب نوشی سے تائب ہو چکے تھے اور ایک باقاعدہ زندگی گزار رہے تھے لہٰذا اصغرؔ کی وفات کے بعد ان کی وصیت کے مطابق نسیم بیگم نے دوبارہ جگرؔ سے شادی کر لی۔

جگرؔ بچپن سے شاعرانہ مزاج لے کر آئے تھے۔کم عمری سے ہی اُنہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔کہا جاتا ہے کہ اُنہوں نے پہلی غزل 14 یا 15 سال کی عمر میں کہی تھی۔شاعری کا یہ شوق عمر کے ساتھ بڑھا اور خاندان کے ادبی ماحول نے اسے مزید قوت عطا کی۔انہوں نے اپنے کلام پر سب سے پہلے داغؔ دہلوی سے اصلاح لی۔یہ اصلاح خط و کتابت کے ذریعہ لی گئی تھی۔لیکن یہ سلسلہ انتہائی مختصر تھا۔اس کے بعد آسیؔ رامپوری اور بعد میں اصغرؔ گونڈوی سے اصلاح لی حالانکہ اس کے باوجود انہوں نے اپنی الگ راہ نکالی۔جگرؔ کی ذاتی زندگی اور شاعری دونوں پر اصغرؔ صاحب کا بہت گہرا اثر پڑا۔اصغرؔ گونڈی سے جگرؔ کی ملاقات 1919ء میں ہوئی اس زمانے میں جگرؔ ذہنی کشمکش اور روحانی اذیت کا شکار تھے۔حد سے بڑھی شراب نوشی نے ان کی زندگی سے ہر قسم کے نظم وضبط کو ختم کر دیا تھا۔ازدواجی زندگی کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ایسے میں اصغرؔ نے انہیں سنبھالا اور رفتہ رفتہ صحیح راہ پر لے آئے۔اپنی سالی سے شادی بھی کرا دی۔جگرؔ کی تربیت ذہنی میں اصغرؔ نے اہم کردار ادا کیا ہے۔جگرؔ فطرتاً انتہائی خلیق، وضع دار، ملنسار اور شریف النفس شخص تھے۔خودداری اور قناعت پسندی ان کی فطرت کا اہم جز و تھی۔رندی و سرشاری کے زمانے میں بھی کوئی سبک بات یا حرکت اُن سے سرزد نہیں ہوئی۔وہ فیاض اور شاہ خرچ بھی تھے بلکہ انہیں کسی قدر لاپرواہ بھی کہا جا سکتا ہے۔جو بھی ہاتھ آتا تھا، بے دریغ خرچ کرتے۔یہی وجہ تھی کہ اکثر و بیشتر ان کا ہاتھ تنگ رہتا تھا۔

جگرؔ کے کلام کے تین مجموعے 'داغِ جگر'، 'شعلۂ طور' اور 'آتشِ گل' شائع ہو چکے ہیں۔'داغ جگر' کے تعلق سے قیاس ہے کہ 1922ء میں شائع ہوا۔اسے مرزا احسان احمد وکیل اعظم گڑھ نے مرتب کر کے بزم ادب اعظم گڑھ سے شائع کیا تھا اور 44 صفحات پر مشتمل ایک طویل مقدمہ بھی لکھا تھا۔جگرؔ کا دوسرا مجموعہ 'شعلۂ طور' 1932ء میں علی گڑھ

سے شائع ہوا۔اس میں جگرؔ کا اس وقت تک کا منتخب کلام شامل تھا۔حامد سعید خاں حامد بھوپالی نے اس مجموعے کو مرتب کیا تھا۔'شعلۂ طور' کا دوسرا ایڈیشن 1934ء میں شائع ہوا اور اس میں اس وقت تک کا کل کلام شامل کر لیا گیا تھا۔ 'آتش گل' جگرؔ کا آخری مجموعہ کلام ہے جو پہلی بار 1954ء میں ڈھاکہ سے شائع ہوا جس میں رشید احمد صدیقی اور آل احمد سرورؔ جیسے مشاہیر ادب نے مضامین لکھے تھے۔1958ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔آخری مجموعے 'آتشِ گل' پر ساہتیہ اکادمی سے 1958ء میں پانچ ہزار روپے کا انعام ملا۔ڈاکٹر محمد اسلام نے لکھنؤ یونیورسٹی سے جگرؔ کی شخصیت اور ان کے فن پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔اس کے علاوہ اُنہوں نے جگرؔ کے غیر مطبوعہ کلام کو نومبر 1964ء میں یادگارِ جگر کے نام سے شائع کر دیا۔جگرؔ کا انتقال 1960ء میں گونڈہ میں ہوا۔انتقال سے ایک برس پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی سند دی تھی۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. جگرؔ کا پورا نام لکھیے۔
2. جگرؔ کی پیدائش کس شہر میں ہوئی؟
3. جگرؔ کے آخری مجموعہ کلام کا نام لکھیے۔

7.4 جگرؔ کی شاعرانہ خصوصیات

جگرؔ غزل کے شاعر ہیں اور غزل اصلاً حسن و عشق کی داستان ہے لیکن غزل صرف حسن و عشق تک ہی محدود نہیں ہے۔شعرا نے غزل میں ہجر و وصال کی کہانیوں کے علاوہ غمِ روزگار، مسرت و خوشی، دنیا کی بے ثباتی کے مضامین بھی نظم کیے ہیں۔غزل دراصل ہمارے تاثرات، احساسات اور جذبات کی آئینہ دار ہے۔وہ ہمیں شاعری کی دوسری اصناف کے مقابلے میں زیادہ متاثر کرتی ہے۔غزل میں ردیف و قافیے کے استعمال کے سبب ہمیں اس کی موسیقی دلفریب لگتی ہے۔غزل میں استعمال ہونے والے الفاظ مثلاً ساقی، ساغر، گل، آشیاں، بلبل صرف وہی معنی نہیں رکھتے جو بظاہر نظر آتے ہیں بلکہ مختلف مقامات پر مختلف معنی اور مفہوم رکھتے ہیں اور کہیں ان الفاظ کا استعمال صرف عشقیہ مفہوم

میں ہوتا ہے۔

جگرؔ حالانکہ کبھی کسی انجمن سے وابستہ نہیں رہے لیکن انہوں نے زمانے کے بدلتے حالات کا جائزہ اپنے کلام میں ضرور لیا۔ اس لیے ''داغِ جگر''، ''شعلۂ طور'' اور ''آتشِ گل'' کے کلام میں اتنا فرق محسوس ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کے ابتدائی کلام میں گہرائی، دلکشی اور رنگینی نہیں ملتی۔ حالانکہ جگرؔ سیاست سے بہت دور رہے مگر انہوں نے اپنے عہد کے حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ مثلاً انہوں نے قحطِ بنگال کے واقعہ سے متاثر ہوکر بڑی خوب صورت غزل کہی ہے۔

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں — ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سر راہ — بے گور و کفن خاک بسر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا وہ بلکنا و سسکنا — ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں

جگرؔ کو ہندوستان کی آزادی کا بے صبری سے انتظار تھا۔ ساتھ ہی کامیابی کا یقین بھی تھا۔ چنانچہ اپنی ایک غزل میں وہ اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی خوشخبری اس طرح دیتے ہیں۔

ارباب وطن کو مری جانب سے ہو مژدہ — اغیار کو مجبورِ سفر دیکھ رہا ہوں
رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیرِ تاباں — ہونے کو ہے اس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
بیداریٔ آزادی و اخلاص و محبت — ایک خلد در آغوشِ نظر دیکھ رہا ہوں
جو خواب کہ شرمندۂ تعبیر تھا اب تک — اس خواب کی تعبیر جگرؔ دیکھ رہا ہوں

لیکن آزادی کے بعد آئی تباہی نے جگرؔ جیسے محبت کرنے والے شخص کو مغموم کر دیا وہ اس صورت حال سے مضطرب ہو گئے اور ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اپنی غزلوں اور نظموں میں انہوں نے ان باتوں کی شکایت کی کہ کیسے تقسیم ہند کے وقت لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔ ان کے خیال میں یہ آزادی ایک بے جان جسم کی شکل میں ہمارے سامنے آئی۔

کہتے ہیں جس کو صورتِ آزادی وطن — دراصل ایک پیکر بے جاں ہے آج کل

7.4.1 جگرؔ کا تصورِ عشق

جگرؔ کی شاعری بھی عشقیہ شاعری ہے۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں شوخی اور عاشقانہ مضامین ملتے ہیں۔ جگرؔ کی 1932ء تک کی شاعری پر روایتی غزل گوئی کا بہت گہرا عکس نظر آتا ہے۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام ''شعلۂ طور'' 1932ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ یہ بھی غزلوں کا مجموعہ ہے لیکن جگرؔ کی اس دور کی شاعری داغؔ، امیر اللہ تسلیمؔ کی غزلوں کے اثر سے خود کو آزاد نہیں کر سکی۔

جگرؔ کے تیسرے مجموعہ کلام ''آتشِ گل'' کے مطالعہ سے ان کی اصل اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں ان کا تصورِ حسن و عشق زیادہ معصوم اور زیادہ صحت مند نظر آتا ہے۔ جگرؔ کی شاعری کا ترنم اور کیفیت فوری طور پر ذہن و دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ فانیؔ کی شاعری پڑھنے والے کو غم کا شکار بنا دیتی ہے۔ لیکن جگرؔ کی شاعری ہمیں افسردہ کرنے کے بجائے ایک میٹھے میٹھے درد سے روشناس کراتی ہے۔

جیسا کہ ابتدا میں آپ نے پڑھا کہ غزل کا غالب موضوع عشق و حسن ہے اور جگرؔ خالصتاً غزل ہی کے شاعر ہیں اس لیے ان کی غزل کا غالب موضوع بھی عشق ہی ہے۔ یہ جذبۂ عشق ان کی ابتدائی شاعری سے لے کر آخری دور کی شاعری تک ان کی شعری فکر کا حصہ بنا رہا۔ وہ سرشاری و سرمستی جو سچے عاشق کی فطرت کا لازمی عنصر بن جاتی ہے، جگرؔ کی شخصیت اور اُن کے فن دونوں پر چھائی رہی۔ وہ دولت شخصیت کے مال نہیں تھے۔ جذبۂ عشق نہ صرف یہ کہ ان کے کلام بلکہ ان کی اپنی زندگی پر بھی عمر بھر حاوی رہا۔ جگرؔ عشق کو زندگی کا سب سے مشکل مرحلہ سمجھتے ہیں۔ عشق کرنا آگ کے دریا کو پار کرنا ہے۔

یہ عشق نہیں آساں اتنا ہی سمجھ لیجیے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

وہ عشق میں مصلحت کے قائل نہیں۔ عاشق وہی ہے جو آگ کے دریا کو پار کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اور جب عشق اس دور پر پہنچ جائے تو پھر وہ سرشاری و سرمستی پیدا ہوتی ہے کہ محبت کرنے والے کو سوائے محنت کے کچھ یاد نہیں رہتا۔

دنیا کے ستم یاد نہ اپنی ہی وفا یاد
اب مجھ کو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

جگر کا جذبۂ عشق محبوب سے مکمل اور مستقل قرب کا خواہاں ہے۔ عاشق کی محبوب سے دوری اس کی موت ہے۔ اور سرشاری و سرمستی کے قائل ہیں لیکن یہ کیفیت کوشش سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔ جگر کے اشعار کی یہ بھی خاصیت ہے کہ ان میں جذبۂ عشق کا بیان شدت احساس لیے ہوا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضان محبت عام سہی عرفان محبت عام نہیں
تری امانت غم کا تو حق ادا کر لوں
خدا کرے شب فرقت ابھی دراز رہے

7.4.2 جگر کا تصور محبوب

جگر کی شاعری کا محبوب سماوی نہ ہو کر ارضی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اردو غزل کی روایت محبوب کی طرح یہ بھی مغرور و خود پسند ہے۔ جگر محبوب کو رسوا نہیں کرتے بلکہ اس کا احترام کرتے ہیں۔ پھر وہ محبوب سے عرض حال کے بھی قائل نہیں ہیں۔ لیکن ان کا محبوب عاشق کے جذبۂ صادق سے متاثر بھی ہوتا ہے۔ جگر چونکہ آداب محبت کے قائل ہیں اس لیے محبوب کی بارگاہ میں خواہش دل کا اظہار کرنے سے خود کو روکتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار دیے جارہے ہیں جن سے جگر کی غزلوں میں تصور محبوب پر بخوبی روشنی پڑتی ہے۔

اف وہ روئے تابناک و چشم تر میرے لیے
ہائے رے زلف پریشاں تا کمر میرے لیے
حسن کی بارگاہ میں رکھیے قدم سنبھال کر
یہ وہ مقام ہے جہاں خواہش دل حرام ہے

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا ان کو پیار آ ہی گیا

7.4.3 جگرؔ اور تصوف

جگرؔ صوفی نہیں تھے۔ اصغرؔ کی صحبت نے ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ ضرور پیدا کر دیا مگر ان کا تصورِ عشق خالص صوفیانہ نہیں بلکہ اس میں ارضی تصورِ عشق بھی شامل ہے۔ اسی لیے اس کی رنگینی کم نہیں ہوئی۔ جگرؔ نے جن مسائل تصوف پر اشعار کہے ہیں وہ کم وبیش وہی ہیں کہ جن پر اردو کے صوفی شعرا کہتے رہے ہیں۔ اصغر گونڈوی چونکہ خود بھی صوفی شاعر تھے اور جگرؔ ان کے بے حد قریب تھے اسی لیے ان کا اثر بھی جگرؔ پر پڑا اور انہوں نے تصوف کے مسائل پر اشعار کہے۔ یوں تو جگرؔ کا تصورِ عشق خالصتاً مجازی ارضی ہے مگر عشق حقیقی کی پرچھائیاں بھی اس پر پڑتی نظر آتی ہیں اور یہ تصور کا ہی اثر ہے۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا فلسفہ تصوف کا محبوب موضوع ہے۔ جگرؔ نے بھی اس موضوع پر شعر کہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں جو تصوف کے تعلق سے جگرؔ نے کہے ہیں۔

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا
کوئی نہ یہاں عدم نہ ہستی
اول و آخر جو کچھ ہے تو ہے
صوفی نے جس کو شاہد سمجھ لیا
اک پرتو لطیف تھا حسن مجاز کا
چشم نظر پرست میں جس کا جہاں نام ہے
حسن تمام یار کا جلوۂ ناتمام ہے

غرض کہ جگرؔ کے مجموعہ کلام ''آتشِ گل'' کی شاعری نے اردو ادب میں ان کے مقام و مرتبہ کی نشاندہی

کردی۔ان کے دو ابتدائی مجموعہ ہائے کلام کے مقابلے میں آتشِ گل کی عشقیہ شاعری بلند پایہ ہے جس کے سبب جگر کا شمار ہماری زبان کے اہم غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. جگر کس صنف کے شاعر تھے؟

5. ''شعلۂ طور'' پہلی بار کب شائع ہوا؟

6. جگر اپنے ہم وطنوں کو کس چیز کی خوشخبری دے رہے ہیں؟

7.5 جگر کی غزل (1)

عشق کی یہ نمودِ پیہم کیا ہو تمہیں تم اگر، تو پھر ہم کیا
جز ترے کچھ نظر نہیں آتا آرزو بن گئی مجسم کیا
ترا ملنا، ترا نہیں ملنا اور جنت ہے کیا جہنم کیا
اس نظر میں نہیں سماتا کچھ جانِ بیتاب و چشم پرنم کیا
عشق خاموش کے مزے ہیں جگر جوش و فریاد و شور و ماتم کیا

7.5.1 غزل کی تشریح

آیئے غزل کے متن (Text) کو پڑھیں اور اس کے مفہوم پر غور کریں لیکن مفہوم پر غور کرنے سے پہلے اس میں استعمال ہونے والے چند الفاظ کے معنی ذہن نشین کر لیجیے۔ جو فرہنگ کے ابتدائی حصے میں دیے گئے ہیں۔

پہلا شعر: غزل کے پہلے شعر کو مطلع کہتے ہیں۔ یہ بہت خوب صورت شعر ہے اس شعر میں جگر نے صوفیانہ انداز میں اپنی بات کہی ہے۔ شاعر کو محبت میں وہ مقام حاصل ہو گیا جس میں ہر طرف محبوب ہی نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں: عشق کی یہ کیسی پے در پے نمائش ہے مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اے محبوب مجھے چاروں طرف تو ہی تو نظر آتا ہے

ہماری یعنی عاشق کی کوئی حیثیت نہیں۔ اگر ہر طرف تیرا ہی جلوہ ہے تو پھر ہمارا اس دنیا میں کیا مقام ہے۔ یعنی ہر چیز میں خدا کا ہی جلوہ ہے جدھر دیکھو وہی نظر آتا ہے۔ جس چیز میں دیکھو اس کی قدرت عیاں ہے ایسے میں انسان کی کیا حقیقت ہے۔

دوسرا شعر: اے دوست ہم ہر پل تیرے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ہمیں دنیا کی ہر شئے میں تو ہی دکھائی دیتا ہے۔ لگتا ہے کہ ہماری آرزو نے جسم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اسی لیے ہمیں دنیا میں صرف تو ہی تو نظر آتا ہے۔ شاعر محبوب کے تصور میں اس قدر ڈوب چکا ہے کہ اسے اس کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔

تیسرا شعر: شاعر اپنے محبوب سے مخاطب ہے کہ اس کی زندگی صرف محبوب کے بارے میں سوچتے گزر گئی۔ محبوب سے وصال اور اس سے جدائی انہیں دو باتوں کے درمیان زندگی ختم ہوگئی۔ یعنی اے دوست اگر تو مل جائے تو زندگی ہمارے لیے جنت ہے اور تو نہ ہو تو پھر یہ زندگی جہنم ہے ہمیں اس زندگی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ محبوب کے بغیر یہ زندگی بے مزہ اور بیکار ہے۔

چوتھا شعر: محبوب کی شکایت غزل کی روایت رہی ہے۔ جگر بھی اس شعر میں کہتے ہیں کہ ہم اپنے محبوب کی محبت میں بے قرار ہیں۔ دن رات اس کے لیے تڑپ رہے ہیں مگر اسے کسی چیز کی قدر نہیں یہاں تک کہ ہماری آنسوؤں سے بھری آنکھیں بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ہماری تڑپتی ہوئی جان اسے ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔ اسے ہماری محبت کا ذرا سا بھی پاس نہیں ہے۔

پانچواں شعر: یہ غزل کا مقطع ہے یعنی آخری شعر جس میں شاعر اپنے تخلص کا استعمال کرتا ہے۔ جگر بھی اس شعر میں اپنے تخلص سے فائدہ اٹھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اے جگر اگر محبت کی ہے تو قوتِ برداشت بھی اپنے اندر پیدا کرو۔ آہ وزاری یا فریاد محبت کرنے والوں کا شیوہ نہیں کیوں کہ خاموش محبت میں جو لطف ہے وہ فریاد کرنے میں نہیں ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. شاعر کو چاروں طرف کون نظر آتا ہے؟

8. محبوب سے ملنا شاعر کے لیے کیسا ہے؟

9. شاعر کی نظر میں کون سی محبت اہمیت رکھتی ہے؟

7.6 جگر کی غزل (2)

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہے فصل بہار پر
مجھے دیں نہ غیظ میں دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مرے سلطنت ہے یہی آشیاں، مرے ملکیت یہی چار پر
عجب انقلاب زمانہ ہے، مرا مختصر سا فسانہ ہے
یہی اب جو بار ہے دوش پر، یہی سر تھا زانوئے یار پر
مری سمت سے اے صبا، یہ پیام آخر غم سنا
ابھی دیکھنا ہو تو دیکھ جا، کہ خزاں ہے اپنی بہار پر
میں رہین درد سہی مگر، مجھے اور چاہیے کیا جگر
غم یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتہ غم یار پر

7.6.1 غزل کی تشریح

پہلا شعر: غزل کے متن کو پڑھیے اور مشکل الفاظ کے معنی یاد کیجیے۔ یہ الفاظ و معنی فرہنگ میں دیے گئے ہیں۔ غزل کی اہم خصوصیت اشارے میں بات کہنا ہے یعنی شاعر اپنی بات براہ راست نہیں کہتا بلکہ اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ اس شعر میں جگر نے وطن سے اپنے تعلق کا بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ پرندہ چمن میں چاہے جہاں رہے وہ درخت کی کسی شاخ پر آشیانہ بنائے یا کہیں اور سارے چمن سے اس کا تعلق ہے چمن کی ہر شئے پر اس کا حق ہے اسی طرح سے میں بھی اپنے وطن سے محبت کرتا ہوں۔ وطن میں میرا گھر کسی بھی جگہ ہو میرا حق تو وطن کی ہر چیز پر ہے۔

دوسرا شعر: شاعر اپنی بات پھر سے اشارے میں بیان کر رہا ہے۔ چمن میں رہنے والے پرندے کا گھر اس کا آشیانہ ہے چاہے آشیانے پر کتنی ہی بجلیاں گریں یا مصیبتیں آئیں پرندہ اپنے گھر سے دور نہیں جا سکتا کیوں کہ اس کی بادشاہت وہی اس کا چھوٹا سا گھونسلا ہے۔ آشیانے کے علاوہ اگر کوئی شئے اس کے نزدیک بہت اہم ہے تو وہ اس کے پر ہیں۔ پرندہ اپنے آشیانے اور پروں کا عاشق ہے، شاعر اپنے وطن کا۔ اسی لیے وہ کہتا ہے کہ چاہے مجھے کتنی ہی تکلیفیں برداشت کرنی پڑیں میں اپنے وطن سے دور نہیں ہو سکتا۔ میرا سرمایہ یہی وطن ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت مجھے میرے گھر/وطن سے جدا نہیں کر سکتی میں کسی کے غیظ و غضب سے خوفزدہ ہونے والا نہیں ہوں۔

تیسرا شعر: دنیا عجیب جگہ ہے وقت اور زمانہ کبھی یکساں نہیں رہتا۔ انقلاب آتے رہتے ہیں۔ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ میری زندگی کی کہانی اگرچہ مختصر ہے مگر وقت کی رفتار نے اسے بھی نہیں بخشا زمانے کے ساتھ میری زندگی میں بھی تبدیلیاں آئی ہیں۔ وہ سر جو پہلے کبھی دوست کے زانو پر تھا آج وہی سر میرے کاندھوں پر بوجھ بن چکا ہے۔ یعنی زندگی پہلے بہت پرسکون تھی۔ خوشیوں سے بھرپور تھی۔ مگر زمانے کے اتار چڑھاؤ نے سارے حالات تبدیل کر دیے آج وہی خوب صورت زندگی ہمارے لیے بوجھ بن چکی ہے۔

چوتھا شعر: شاعر اپنی جانب سے محبوب کو ایک آخری پیغام صبا کے ذریعے بھیج رہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے ہوا تیرا گزر تو ہر جگہ سے ہے تجھے تو محبوب کی گلی میں جانے سے کوئی نہیں روک سکتا جب تو ادھر سے گزرے تو میرا بھی ایک کام کرنا میرے محبوب کو یہ پیغام دینا کہ میں پورے طور سے تباہ و برباد ہو چکا ہوں وہ مجھے تباہ کرنا چاہتا تھا آج میری بربادی عروج پر ہے اگر اسے اپنی زیادتیوں کا نتیجہ دیکھنا ہے تو آ جائے اور دیکھ لے کہ میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہوں۔

پانچواں شعر: آپ جانتے ہیں کہ غزل کے آخری شعر کو مقطع کہتے ہیں یعنی قطع ہونے / ختم ہونے کی جگہ۔ اس میں شاعر اپنے تخلص کا استعمال کرتا ہے یعنی اس نام کا جسے اس نے شعر کہنے کے لیے اختیار کیا۔ جگر کی غزل کا یہ آخری شعر ہے بڑے خوبصورت انداز میں وہ اپنی بات کہتے ہیں۔ میں درد کا احسان مند ہوں اور اس کے علاوہ مجھے کسی

اور چیز کی خواہش نہیں ہے یہ درد ہی میرا اصل ساتھی ہے۔ محبت کے اس درد نے مجھے جینا سکھایا ہے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے ہیں۔ دوست کا غم میرا شیفتہ ہے اور میں اس پر فدا ہوں اس کا عاشق ہوں یہ سبب ہے کہ مجھے جینے کے لیے کسی اور شئے کی ضرورت نہیں میں خوش ہوں کہ دوست کے ذریعہ دیا گیا غم میرا ساتھی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. شاعر کی چمن سے کیا مراد ہے؟
11. شاعر کا مختصر فسانہ کیا ہے؟
12. وہ کس چیز پر فریفتہ ہے؟

7.7 خلاصہ

جگؔر مرادآبادی کا اصل نام علی سکندر اور تخلص جگؔر تھا۔ 1890ء میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد علی نظرؔ تھا۔ ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہی ہوئی۔ بعد میں باندہ چلے گئے اور چچا کے ساتھ رہ کر تعلیم حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد لکھنؤ چلے آئے۔ جگؔر نے بچپن سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ آسؔارام پوری اور اصغؔر گونڈوی سے اصلاح لی۔ خاص طور پر اصغر سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ جگؔر کے تین دواوین ''داغ جگر''، ''شعلۂ طور'' اور ''آتش گل'' شائع ہو چکے ہیں۔ آخری مجموعے پر ساہتیہ اکادمی نے انعام بھی دیا۔ جگؔر کا انتقال 1960ء میں گونڈہ میں ہوا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری بھی عطا کی تھی۔

جگؔر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزلوں کا غالب موضوع داستان حسن و عشق ہے۔ لیکن جگؔر کا تصور حسن و عشق ایک قسم کی معصومیت سے سرشار ہے۔ وہ ایک مترنم شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں بلا کی موسیقیت پائی جاتی ہے۔ جہاں تک عصری آگہی اور سماجی شعور کی بات ہے تو جگؔر کا کلام اس سے بھی محروم نہیں ہے۔ قحط بنگال اور تقسیم ہند جیسے موضوعات پر انہوں نے اپنے غزلیہ اشعار میں غزل کی تمام تر روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے۔ شامل نصاب جگؔر کی دونوں غزلیں ان کے کلام کی خصوصیات کا احاطہ کرتی ہیں۔ پہلی غزل میں انہوں نے جلوۂ

محبوب کی ہمہ گیریت، تصورِ محبوب، عاشق سے معشوق کی بے اعتنائی اور معاملاتِ عشق میں فریاد و ماتم سے ممانعت جیسے مضامین کو نظم کیا ہے۔ دوسری غزل میں جگرؔ نے اپنی ذات اور اس کے اختیارات کو چمن اور پرندہ کی رعایت سے بیاں کیا ہے۔ جگرؔ کے بقول وقت ہمیشہ یکساں نہیں رہتا اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے محبوب کو بلاؤ تاکہ وہ میری بربادی دیکھ لے۔ کیوں کہ اسے یہی مقصود تھا۔ آگے ان کا کہنا ہے کہ میرا دردِ دل ہی اب میرا ساتھی ہے۔ اور مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ یہ دونوں غزلیں روایتی طرزِ اظہار کا نمونہ ہیں لیکن ان میں لہجے کی وہ تمکنت پائی جاتی ہے جو جگرؔ کے اندازِ بیان کی خصوصیت تھی۔

7.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. جگرؔ مرادآبادی کی ابتدائی تعلیم کس طرح ہوئی؟
2. جگرؔ کی شاعری کی اہم خصوصیات پر مختصراً اظہارِ خیال کیجیے۔
3. آزادی ملنے کے بعد بھی جگرؔ کا دل خوش کیوں نہ ہوا؟

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. جگرؔ مرادآبادی کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔
2. جگرؔ کی ابتدائی شاعری اور ''آتشِ گل'' کی شاعری میں فرق واضح کیجیے۔
3. جگرؔ کی پہلی اور دوسری غزلوں سے اپنی پسند کے تین تین اشعار کی تشریح کیجیے۔

7.9 فرہنگ

نمود	نمائش	پیہم	لگاتار
جز	سوائے	مجسم	جسم بنایا ہوا
جانِ بیتاب	تڑپتی ہوئی جان	چشم پرنم	آنسوؤں سے بھری آنکھیں

غیظ	سخت غصہ	سلطنت	بادشاہت
ملکیت	بادشاہت	انقلاب زمانہ	زمانہ کی گردش
دوش	کاندھا	زانو	گھٹنا
پیام	پیغام	خزاں	پت جھڑ
رہین	مرہون/احسان مند	شیفتہ	فریفتہ/عاشق
فریفتہ	فریب میں آیا ہوا (مجازاً) عاشق		
غم یار	دوست کا غم	جلا	چمک، روشنی
اعزاز	عزت، توقیر مرتبہ	سند	ثبوت، نظیر، سرٹیفکیٹ
عہد	زمانہ	ہجر	جدائی
وصال	ملاقات	بے ثباتی	ناپائیداری
اصناف	صنف کی جمع۔قسم		
ردیف	شعر کے آخر میں بار بار آنے والے الفاظ		
قافیہ	شعر میں استعمال ہونے والے ہم وزن الفاظ		
دلفریب	خوبصورت	رند	شرابی
ساغر	پیمانہ	شمشیر	تلوار
بکف	ہاتھ میں	ناصح	نصیحت کرنے والا
بہتات	زیادتی/ کثرت	انجمن	محفل
گور	قبر	ارباب	لوگ
مژدہ	خوشخبری	راغب	متوجہ

7.10 معاون کتابیں

1. جگر۔فن اور شخصیت : شارب ردولوی
2. تاریخ ادبِ اردو : اعجاز حسین
3. جگر مرادآبادی حیات اور شاعری : محمد اسلم

7.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. جگر کا پورا نام علی سکندر ہے۔
2. جگر کی پیدائش بنارس میں ہوئی۔
3. جگر کے آخری مجموعہ کلام کا نام ''آتشِ گل'' ہے۔
4. جگر غزل کے شاعر تھے۔
5. ''شعلۂ طور'' 1932ء میں پہلی بار شائع ہوا۔
6. جگر اپنے ہم وطنوں کو آزادی کی خوشخبری دے رہے ہیں۔
7. شاعر کو چاروں طرف محبوب نظر آتا ہے۔
8. محبوب سے ملنا شاعر کے لیے جنت ہے۔
9. شاعر کی نظر میں خاموش محبت اہمیت رکھتی ہے۔
10. شاعر کی چمن سے مراد اپنا ملک ہے۔
11. شاعر پہلے محبوب سے قریب تھا مگر بعد میں وہ محبوب کے ساتھ نہ رہ سکا۔
12. وہ غمِ یار پر فریفتہ ہے۔

اکائی 6 : مجروحؔ سلطان پوری

ساخت

8.1 اغراض ومقاصد

8.2 تمہید

8.3 حیات

8.4 مجروحؔ کی شاعرانہ خصوصیات

8.5 مجروحؔ کی غزل اور اُس کی تشریح وتوضیح (1)

8.6 مجروحؔ کی غزل اور اُس کی تشریح وتوضیح (2)

8.7 خلاصہ

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

8.9 فرہنگ

8.10 معاون کتابیں

8.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

8.1 اغراض ومقاصد

یہ اکائی اردو کے نامور غزل گو شاعر اور مشہور فلمی نغمہ نگار مجروحؔ سلطان پوری کی شاعرانہ خصوصیات کے تفصیلی جائزے پر مبنی ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ مجروحؔ سلطان پوری کی زندگی کے مختصر حالات اور ان کی غزل گوئی کی اہم اور نمایاں خصوصیات کے تعلق سے معلومات حاصل کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی مجروحؔ کی درج نصاب دو غزلوں کے اشعار کی تشریح سے آپ کو ان اشعار کے مفہوم اور ان کے ادبی وفنی نیز شعری محاسن سے واقفیت حاصل ہوگی۔ ہر حصۂ مضمون کے آخر میں آپ کے مطالعے کی جانچ کے لئے چند سوالات دیے جارہے ہیں۔ ان کے

جوابات سے آپ اپنے مطالعے سے حاصل کردہ معلومات کی جانچ کرسکیں گے۔ پوری اکائی کا خلاصہ درج کرنے کے ساتھ ہی امتحانی سوالات کے نمونے، مشکل الفاظ کے معنی اور معاون کتابوں کی فہرست بھی دی جارہی ہے جو آپ کے مطالعے کو مزید افادیت بخشے گی۔ آپ کی سہولت کے لئے اپنے مطالعے کی جانچ کے عنوان کے تحت پوچھے گئے سوالوں کے جواب بھی دیے جارہے ہیں۔

8.2 تمہید

غزل کو اردو شاعری کی آبرو کہا گیا ہے۔ اردو کی تمام اصناف شعر میں جو مقبولیت و اہمیت غزل کو حاصل ہوئی وہ کسی اور صنف کے حصے میں نہ آسکی۔ قصیدہ درباروں کے ساتھ ختم ہوگیا۔ مثنویوں کا رواج نہ رہا۔ مرثیے کا تعلق ادب کے ساتھ عقیدے سے بھی تھا اس لئے ابھی کسی حد تک باقی ہے مگر غزل کل بھی مقبول عام تھی اور آج بھی اس کی مقبولیت قائم ہے۔ نہ صرف یہ کہ قائم ہے بلکہ روز بروز بڑھتی بھی جارہی ہے۔ غزل کی اس عدیم المثال مقبولیت سے قطع نظر اس پر کئی ادبی و نیم ادبی حلقوں کی جانب سے حملے بھی خوب ہوئے۔ کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن قرار دیا۔ ترقی پسند شعرا نے اپنے افکار و خیالات کے اظہار کے لئے اس کی فنی و شعری حدود کا شکوہ کیا اور عظمت اللہ نے تو اس صنف کی گردن ہی مار دینے کا مشورہ دے ڈالا۔ ایسے پرآشوب دور میں جب غزل پر ہر طرف سے حملے ہورہے تھے اس کے دفاع میں خود ترقی پسند شعرا کے حلقے سے ہی دو اہم ترین شعرا سامنے آئے۔ یعنی فیض احمد فیض اور مجروح سلطان پوری۔ فیض نے انتہائی خوبصورت غزلیں کہیں لیکن نظم نگاری سے بھی اپنا رشتہ اسی قدر استوار رکھا۔ مگر مجروح شروع سے آخر تک محض غزل گو ہی رہے۔ یہاں تک کہ ان کے اکلوتے شعری مجموعے کا عنوان بھی ''غزل'' ہی قرار پایا۔ ذیل میں ہم اردو کے اسی ممتاز غزل گو شاعر کی حیات اور اس کی شاعرانہ خصوصیات کا جائزہ لیں گے۔

8.3 حیات

مجروح سلطان پوری کا پورا نام اسرار حسن خاں تھا۔ نسلاً پٹھان تھے۔ خاندان کا تعلق اتر پردیش کے ضلع سلطان پور سے تھا۔ مجروح کے والد محمد حسن خاں محکمۂ پولیس میں ملازم تھے اور مجروح کی ولادت کے وقت اعظم گڑھ

(یوپی) میں فرائض ملازمت انجام دے رہے تھے۔ مجروحؔ اعظم گڑھ کے ہی ایک قصبے نظام آباد میں یکم اکتوبر 1919ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ نظام آباد میں ہی گزرا اور وہیں مجروحؔ نے ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی جو کہ عربی، فارسی اور اردو پر مشتمل تھی۔ کیونکہ 1921ء میں تحریک خلافت کے دوران ان کے والد نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مجروحؔ کو انگریزی کی تعلیم نہیں دی جائے گی۔ 1928ء میں وہ قصبہ ٹانڈہ ضلع فیض آباد (یوپی) آ گئے اور ایک مدرسے میں انہیں داخل کردیا گیا تاکہ درس نظامی کی تکمیل کرسکیں لیکن ایک مدرس سے جھگڑے کی وجہ سے مجروحؔ مدرسے سے ہٹا دیے گئے اور اس طرح مذہبی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ کچھ عرصے بیکار رہنے کے بعد 1933ء میں وہ لکھنؤ آ گئے اور یہاں طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ مجروحؔ بہت ذہین طالب علم تھے اور طالب علمی ہی کے زمانے میں طب پر انہیں کافی دستگاہ حاصل ہوگئی تھی۔ طب کے ساتھ ہی موسیقی کی طرف بھی ان کی طبیعت مائل تھی اور لکھنؤ کے دوران قیام انہوں نے میوزک کالج میں بھی داخلہ لے لیا تھا۔ 1938ء میں طبیہ کالج سے طب کی سند حاصل کرنے کے بعد مجروحؔ پھر فیض آباد کے قصبہ ٹانڈہ آ گئے اور انہوں نے یہیں مطب کرلیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے آبائی وطن سلطان پور واپس آ گئے۔

مجروحؔ کی طبیعت شعر گوئی کی طرف بچپن سے ہی مائل تھی۔ پندرہ، سولہ سال کی عمر سے ہی انہوں نے شعر کہنا شروع کردیا تھا۔ یہ 1935ء یا 1936ء کا زمانہ تھا۔ سلطان پور کے ایک مشاعرے میں مجروحؔ شریک ہوئے اور پہلی بار غزل سنائی۔ انہیں بے پناہ داد ملی اور انہوں نے مولانا آسی الدین کی شاگردی اختیار کرلی۔ مولانا آسی کا شمار اساتذۂ وقت میں ہوتا تھا اور وہ اتفاق سے اس مشاعرے میں بھی شریک تھے کہ جہاں مجروحؔ نے اپنی پہلی غزل پڑھی تھی۔ یہ سلسلۂ اصلاح بہت دنوں نہ چل سکا اور مجروحؔ نے پھر کسی کو اپنا کلام بغرض اصلاح نہیں پیش کیا اور خود محنت کرکے فن شاعری اور زبان و بیان پر قدرت حاصل کی۔ ان کی ذہنی تربیت میں جگرؔ مرادآبادی اور رشید احمد صدیقی کا نمایاں کردار رہا۔ رشید صاحب نے تین سال تک انہیں علی گڑھ میں اپنے گھر پر رکھا جہاں مجروحؔ نے کلاسیکی ادب کا وسیع مطالعہ کیا۔

1945ء میں ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے مجروحؔ نے جگرؔ مرادآبادی کے ساتھ ایک مشاعرے میں

شرکت کے لئے ممبئی کا سفر اختیار کیا۔ یہ مشاعرہ مجروحؔ کی زندگی کا اہم ترین موڑ ثابت ہوا۔ مشاعرے میں موجود اس وقت کے صف اول کے ڈائرکٹر عبدالرشید کاردار نے اپنی نئی فلم شاہ جہاں میں گیت لکھنے کے لئے مجروحؔ کو ملازمت کی پیش کش کی۔ تنخواہ پانچ ہزار روپے ماہانہ مقرر ہوئی اور پھر مجروحؔ ممبئی کے ہی ہو رہے۔ شاہ جہاں کے گانے اس وقت کے مایہ ناز گلوکار کے۔ ایل سہگل نے گائے تھے۔ نوشاد کی موسیقی اور سہگل کی آواز میں مجروحؔ کے لکھے ان گانوں نے برصغیر میں ایک دھوم مچادی۔ ''غم دیے مستقل'' اور ''جب دل ہی ٹوٹ گیا'' جیسے گانوں سے مجروحؔ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ یہ مجروحؔ کے فلمی سفر کا آغاز تھا جو کم وبیش پچپن برس تک جاری رہا اور ان کی موت پر ہی ختم ہوا۔ مجروحؔ نے فلموں میں تقریباً ساڑھے تین سو گانے لکھے جن میں شاہ جہاں' ممتا' آرتی' پاکیزہ' پے ئنگ گیسٹ' انداز' آرزو' فٹ پاتھ' میرے صنم' تیسری منزل اور دوستی جیسی مشہور اور کامیاب فلموں کے گانے شامل ہیں۔ مجروحؔ نے فلمی نغموں کو ادبیت اور شعریت سے ہمکنار کیا۔ اردو کے بہت سے الفاظ جو عام بول چال کی زبان میں کم استعمال ہوتے تھے ان نغموں کی بدولت لوگوں کی زبان پر چڑھ گئے۔

ممبئی کے دوران قیام ہی اشتراکیت اور ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کی وابستگی کا آغاز ہوا اور وہ آہستہ آہستہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سرگرم کارکن بن گئے۔ وہ کمیونسٹ پارٹی کے بھی ممبر بن گئے اور پارٹی کی کارروائیوں میں حصہ لینے لگے۔ اسی دور میں انہوں نے چند ایسے اشعار اور نظمیں کہیں جن کی وجہ سے انہیں جیل بھی جانا پڑا اور وہ ایک سال تک جیل میں رہے۔ 1953ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''غزل'' شائع کیا۔ فلموں کی مصروفیات کی وجہ سے مجروحؔ کا شعری سفر بہت متاثر ہوا اور ان کا یہی مجموعہ کلام مختلف ناموں سے بار بار برائے نام اضافے کے ساتھ سامنے آتا رہا۔ مجروحؔ کے انتقال سے ایک سال قبل 1999ء میں یہ آخری بار مشعل جاں کے نام سے شائع ہوا۔

مجروحؔ نے ممبئی میں ایک آسودہ اور خوش حال زندگی گزاری۔ ان کی خانگی زندگی آرام وسکون سے گزر رہی تھی کہ انہیں ایک ایسے حادثے کا سامنا کرنا پڑا جس نے ان کی تندرستی' ان کا عزم اور زندگی میں ان کی دلچسپی کو یکسر ختم

کر دیا۔ یہ حادثہ ان کے جوان بڑے بیٹے کی اچانک موت کا تھا جس نے مجروحؔ کی کمر توڑ دی اور وہ بیمار رہنے لگے۔ یہ بیماری بڑھتی گئی اور آخر کار 24 رمئی 2000ء کو بمبئی کے لیلاوتی اسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

مجروحؔ کی زندگی میں ان کے علم وفن کا خاطر خواہ اعتراف کیا گیا اور انہیں مختلف اعزازات سے نوازا گیا۔ جن میں ہندوستانی فلم انڈسٹری کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ بھی شامل ہے۔ ان کی شاعری کا انگریزی ترجمہ Never Mind Your Change کے نام سے شائع ہوا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. مجروحؔ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. وہ درس نظامی کی تکمیل کیوں نہ کر سکے؟
3. مجروحؔ نے کس فلم میں پہلی بار گانے لکھے؟
4. مجروحؔ کا مجموعہ کلام پہلی بار کس نام سے شائع ہوا؟
5. انہیں فلمی دنیا کا کون سا اعزاز دیا گیا؟

8.4 مجروحؔ کی شاعرانہ خصوصیات

مجروحؔ سلطان پوری اپنے عہد کے ایک مقبول شاعر رہے ہیں۔ کسی شاعر کی عوامی مقبولیت عموماً اس کے ادبی مرتبے پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ مجروحؔ کی عمومی مقبولیت کے سبب بعض سنجیدہ ناقدین بہت دیر سے ان کی جانب متوجہ ہوئے یہاں تک کے مجروحؔ نے زندگی کی آخری سانس لے لی۔ گذشتہ کئی دہائیوں سے مجروحؔ کے چند اشعار زبان زد خاص وعام ہیں۔ ایسا کم ہوتا ہے کہ اتنا مختصر کہنے کے باوجود کوئی شاعر صرف چند شعروں کے ذریعہ دل ودماغ میں جگہ بنالے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
ہجوم دیں میں بدلی نہ غم نے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

ان اشعار کی مقبولیت کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟ ان میں معنی کی وہ قیمت بھی نہیں جو اچھی یا بڑی شاعری کے لئے ضروری تصور کی جاتی ہے۔ باتیں بالکل صاف اور ساتھ کی ہیں۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

یہ شعر نہ جانے کتنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہوا ہوگا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجروحؔ کا درج بالا شعر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شناخت بن گیا۔ اچھے شعر کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اسے ہر مکتب خیال کا آدمی اپنے سیاق میں پڑھتا ہے اور اپنے ذوق اور ضرورت کے مطابق معنی برآمد کر لیتا ہے۔ مجروحؔ کے ان اشعار کی مقبولیت میں جہاں ان میں پائے جانے والے عصری کرب کا دخل ہے اور اس کے جواب میں زندگی کو لطف و مسرت سے بسر کرنے کی تمنا ہے وہیں غزل کے اصل مزاج اور اس کی روایت کی پاسداری کا بھی دخل ہے۔

مجروحؔ کو ہم اردو غزل کا مزاج شناس کیوں کہتے ہیں؟ غزل اور نظم کے بہت اچھے شعرا ان کے عہد میں موجود تھے۔ خود جگرؔ جو سرمستی اور تغزل میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتے تھے ان سے مجروحؔ کو بہت قربت تھی، غلام ربانی تاباںؔ، جذبیؔ، کیفیؔ، سردار جعفریؔ، وامقؔ، پرویز شاہدیؔ اور دوسرے ترقی پسند و غیر ترقی پسند شعرا موجود تھے۔ ان سب کی اپنی جگہ ایک اہمیت ہے۔ مگر ایک خاص بات جو دوسروں کے مقابلے میں قاری کو مجروحؔ کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان

کی تغزل پسندی یا دوسرے لفظوں میں غزل کی مزاج شناسی ہے۔ ہماری غزل کی روایت بہت قدیم' توانا اور مضبوط ہے۔ غزل کے سفر میں ایک موڑ ترقی پسندی کا آیا اور دوسرا جدیدیت کا۔ ترقی پسندی کے زمانے میں ایک مرتبہ پھر غزل کو آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ نظموں کا چلن عام ہوا۔ اور غزل باد مخالف کی زد میں آ گئی۔ اس وقت بھی مجروحؔ نے غزل کا دامن نہیں چھوڑا۔ ان کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ جو موضوعات نظم میں پیش کیے جا رہے ہیں ان کو غزل کے پیکر میں ڈھالا جائے۔ مجروحؔ غزل کی قوت و طاقت کے معترف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غزل سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔ اور ایک مشکل وقت میں غزل کو سہارا دیا۔ اب اگر ان کے اشعار کبھی کبھی نعرہ بن جاتے ہیں تو یہ ان کی تخلیقی مجبوری تھی۔ ایک طرف وقتی تقاضے اور ضرورتیں تھیں اور دوسری طرف غزل کا ایمائی لہجہ تھا۔ مجروحؔ کے چند اشعار میں وہ للکار اور احتجاج ہے جو نعرہ بازی کی سطح تک پہنچ جاتا ہے لیکن ان اشعار کی بنا پر مجروحؔ کی گرفت کرنا غلط ہے۔ کسی شاعر کے کلام کو مجموعی اعتبار سے دیکھنے کی ضرورت ہے تا کہ اس کی شاعری کا مساوی رنگ اور رجحان سامنے آ سکے۔

غزل اس وقت تک اچھی غزل ہے جب تک اس کے رشتے کلاسیکی غزل سے قائم ہیں۔ جہاں کلاسیکی رشتے ٹوٹ جاتے ہیں وہاں غزل غزل نہیں رہتی کسی کا کوئی ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ دراصل غزل بھی ایک جمالیاتی پیکر ہے۔ جہاں غزل سے جمالیات الگ ہو جاتی ہے وہاں وہ غزل نہیں رہ پاتی۔ مجروحؔ کی غزل اس جذبے اور احساس کی ترجمان ہے۔

مجھے سہل ہو گئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ جلا دیا کبھی اک چراغ بجھا دیا

کبھی جادۂ طلب سے جو پھرا ہوں دل شکستہ
تری آرزو نے ہنس کر وہیں ڈال دی ہیں باہیں

اس نظر کے اٹھنے میں اس نظر کے جھکنے میں
نغمۂ سحر بھی ہے آہ صبح گاہی بھی

مجروحؔ کے یہ اشعار خالص عشقیہ معلوم ہوتے ہیں اب یہ استعمال کرنے والوں پر ہے کہ وہ انہیں کس سیاق و سباق میں استعمال کرتے ہیں۔ منشائے مصنف کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے فیضؔ سے متعلق ایک مضمون میں یہ بحث اٹھائی ہے کہ فیضؔ کے یہاں ہم سیاسی معنی تلاش کرتے ہیں اگر یہی مضمون اٹھارہویں صدی کے کسی شاعر کے کلام میں ہوتو ہم کہتے ہیں کہ وہ عشقیہ صنف سے تعلق رکھتا ہے۔ سیاسی اور عشقیہ مفہوم کا تعلق بڑی حد تک ہماری قرأت سے ہے۔ یہ بات نہایت اہم ہے کہ کسی شعر کو پڑھتے وقت ہم اس سے کس طرح کا مکالمہ قائم کرتے ہیں۔ ایک اچھا شعر کسی قاری کو اس کے ذوق کے مطابق کچھ نہ کچھ اپنی جھولی سے نکال کر عطا کر دیتا ہے۔ مجروحؔ بھی ان ہی شاعروں میں ہیں جن کے یہاں سیاسی مفاہیم کی تلاش کا عمل ہنوز جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ مجروحؔ کے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ ہمیں کیوں کر سرور وانبساط سے ہم کنار کرتے ہیں۔ ہاتھ میں ہاتھ آجانا اور چراغ راہ کا جل جانا' شب انتظار کی کشمکش میں چراغ کا جلانا اور بجھانا' آرزو کا ہنس کر باہیں ڈال دینا۔ نظر کے اٹھنے اور جھکنے کو نغمۂ سحر اور آہ صبح گاہی سے تشبیہ دینا دراصل غزل کی اس تہذیب اور روایت کا اظہار ہے جو میرؔ' غالبؔ' اقبالؔ' یگانہؔ' حسرتؔ' فانیؔ' فراقؔ اور جگرؔ کے وسیلے سے ہم تک پہنچی ہے۔ مجروحؔ کے یہ اشعار کلاسیکی غزل سے ہم آہنگ ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز' محبت کی ایسی دھیمی دھیمی آنچ دراصل غزل کے ایک پورے کلچر کو نمایاں کرتی ہے۔ گزشتہ تین چار دہائیوں کے درمیان عصری آگہی کی اصطلاح اتنی عام ہوئی اور اس کا استعمال اس کثرت سے ہوا کہ زندگی کی ازلی اور دائمی قدریں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں۔ عصری حسیت کو چند بندھے ٹکے موضوعات کی روشنی میں دیکھا اور سمجھا جانے لگا۔ اس کے اظہار میں بھی کچھ الفاظ وتراکیب کو ضروری سمجھا گیا۔ اس صورت میں مجروحؔ کی غزل کا مخصوص اسلوب بدلے ہوئے اس مذاق ومزاج کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مجروحؔ سے اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ وہ بدلے ہوئے وقت میں خود کو تبدیل نہیں کر سکے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مجروحؔ نئی آگہی یا عصری آگہی کا ادراک

نہیں رکھتے تھے اور لازماً وہ نئی تبدیلیوں کا خیر مقدم نہیں کر سکے۔ مجروحؔ کے یہاں زبان کا ایک طے شدہ نظام ہے اور وہ اس سے باز آنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مجروحؔ اگر زبان کی اس حد کو توڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو ان کی غزل میں زیادہ تنوع آ سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے رنگ میں جو کچھ کہا ہے اس کی تازگی ہمیشہ باقی رہے گی۔ جیسا کہ ذکر آ چکا ہے کہ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ ان کے یہاں عصری حسیت نہیں ہے شاید ایسا کہنے والوں نے عصری حسیت کے پورے سیاق کی طرف توجہ نہیں دی۔ مجروحؔ کے یہاں عصری حیثیت کو بیانیہ کی شکل میں تلاش کرنا درست نہیں ہوگا۔ مجروحؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور ان کی غزل کلاسیکیت میں رچی بسی ہے۔ اس لیے وہ جو بات کرتے ہیں وہ بھی استعاروں اور کنایوں کے لباس میں ہوتی ہے۔ وہاں تک پہنچنے میں قاری کو بھی شعری جمالیات کے ساتھ سفر کرنا پڑتا ہے۔ مجروحؔ کی غزل کا ڈکشن چوں کہ کلاسیکی غزل سے مستعار ہے اس لئے بعض جدت پسند مجروحؔ کو پسند نہیں کرتے۔ چمن، باغباں، زنداں، گلشن اور اس طرح کے دوسرے الفاظ سے خواہ مخواہ کی الرجی کلاسیکی شاعری کے مزاج اور اس کے امکانات سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوئی ہے۔ مجروحؔ بنیادی طور پر شاعر ہیں وہ ترقی پسند ہیں یا غیر ترقی پسند ایک طالب علم کو ان باتوں سے زیادہ دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔ اصل چیز شعری متن ہے۔ اس کا فکری نظام جس اسلوب کے ذریعہ سامنے آیا ہے وہی شاعر کی بڑی طاقت ہے۔ متن سے باہر کچھ نہیں ہے۔ ادب کا ایک سچا اور سنجیدہ طالب علم اور قاری متن میں پوشیدہ آگہی اور بصیرت سے اپنے شعور و آگہی میں اضافہ کرتا ہے۔ مجروحؔ کی غزل اردو غزل کا ایک اہم حوالہ ہے اگر کسی تخلیق میں کوئی حسن ہے تو ہمیں اس کی تعریف کرنا چاہئے۔ صرف اس لئے ہم کسی چیز کی تعریف نہ کریں کہ وہ ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ یہ کوئی علمی دیانت داری نہیں ہے۔ مجروحؔ کی غزل جس طرح ہمارے دلوں کو چھوتی ہے اور ان میں ارتعاش پیدا کرتی ہے وہ مجروحؔ کی انفرادیت ہے۔ ترقی پسند غزل پر جو اعتراضات رہے ہیں مجروحؔ کی غزل خود ان کا جواب ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مجروحؔ کا یہ کارنامہ ہے کہ انہوں نے بتایا کہ غزل میں Potentiality کتنی ہے اور وہ عصری تبدیلیوں کا کتنا ساتھ دے سکتی ہے۔ مجروحؔ نے مشکل وقت میں بھی زندگی کی رجائیت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اپنی کج کلاہی قائم رکھی۔

مجروحؔ کی ترقی پسندی کا اصل رشتہ ہماری ترقی پسندی کی اس روایت سے بھی ہے جو ایک مدت سے ہماری شاعری میں موجود ہے۔غالب کے چند اشعار کو مجروحؔ کے اشعار کے ساتھ پڑھیے۔

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں　　ایک جگر ہے مرے پانو میں زنجیر نہیں
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل　　جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجیے　　کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے
احباب چارہ سازئی وحشت نہ کر سکے　　زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

اب ذرا مجروحؔ کے یہ شعر پڑھیے۔

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
سر شک رنگ نہ بخشے تو کیوں ہو بار مژہ
لہو حنا نہیں بنتا تو کیوں بدن میں رہے
رہے نہ آنکھ تو کیوں دیکھئے ستم کی طرف
کٹے زبان تو کیوں حرف ناسزا کہیے
نہ ہم قفس میں رکے مثل بوئے گل صیاد
نہ ہم مثالِ صبا حلقۂ رسن میں رہے

مجروحؔ کی غزل میں کلاسیکی غزل کا رچاؤ اور اس کی روح موجود ہے۔ مجروحؔ جیسی غزل کہنے والے کتنے ہیں۔کلاسیکی غزل کے تمام شعری لوازمات کو برتنا ہمیشہ ایک چیلنج رہا ہے۔ جو لوگ کلاسیکی غزل کے لفظیاتی نظام اور اس کے جذب و کیف سے نا آشنا ہیں وہ مجروحؔ کی غزل سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی بصیرت مل سکتی ہے۔ مجروحؔ کی شاعری دل کی بھی ہے اور دماغ کی بھی اور مجروحؔ کی غزل میں ایک پورا کلچر سمٹ آیا ہے۔ زندگی کی ایک

پوری تہذیب کو مجروحؔ کی غزل میں دیکھا جاسکتا ہے۔غزل کی تہذیب کیا ہے؟ کون سی تہذیب اس عہد کی ہے جس عہد سے ہمارا رشتہ ہے۔اس عہد میں احتجاج کے الفاظ کس طرح کے ہوسکتے ہیں۔مجروحؔ نے کہا تھا۔

امن کا جھنڈا اس دھرتی پر کس نے کہا لہرانے نہ پائے
یہ بھی کوئی ہٹکر کا ہے چیلا مارلے ساتھی جانے نہ پائے

یہ شعر مجروحؔ مزدوروں کے لئے کہہ رہے ہیں۔ یہاں مجروحؔ کو للکارنا تھا اپنے ساتھ لوگوں کو لانا تھا' وہ شاعری نہیں کررہے تھے وہ نعرہ لگا رہے تھے' آواز دے رہے تھے اور یہاں وہ اس تہذیب کے دائرے میں احتجاج کررہے تھے۔

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

وہ چند اشعار جن میں غزل کا فن مجروحؔ ہوا ہے ان کو سامنے رکھ کر اگر مجروحؔ کی غزل گوئی کو ہم نظر انداز کردیں تو مجروحؔ سے زیادہ اپنے ساتھ زیادتی ہوسکتی ہے اور ہم غزل کے ایک روشن باب سے محروم ہوجائیں گے۔

تو اے بہار گریزاں کسی چمن میں رہے
مرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے
بلا ہی بیٹھے جب اہلِ حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لیے اک صنم کا ہاتھ چلے
مجروحؔ لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہگار کی طرح

دیکھئے کس طرح مجروحؔ کی شاعری ہمارے جذبے میں ارتعاش پیدا کرتی ہے اور ہمارے محسوسات کو بیدار کرتی ہے۔ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس نئے پن کے دور میں مجروحؔ کی غزل'

غزل کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے اور یہی وہ خوبی ہے جو مجروحؔ کو غزل کا ایک مزاج شناس بناتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

6. مجروحؔ کا کون سا شعر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شناخت بن گیا؟

7. غزل کب غزل نہیں رہتی؟

8.5 مجروحؔ کی غزل اور اُس کی تشریح وتوضیح (1)

مجروحؔ سلطان پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ عموماً انہیں ترقی پسند غزل کا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے جو غلط بھی نہیں لیکن ان کی غزل اپنے کلاسیکی رچاؤ اور تخلیقی حسیت کے سبب کسی مخصوص اور محدود خانے میں بند نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مجروحؔ کو پڑھنے اور پسند کرنے والوں میں مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ شامل رہے ہیں۔ مجروحؔ سلطان پوری کی مندرجہ بالا غزل میں کلاسیکی رچاؤ اور غزل کے وہ تمام لوازمات موجود ہیں جن سے غزل کا ایک خوشگوار تصور قائم ہے۔ اس غزل کا مطلع دوسرے اشعار کے مقابلے میں زیادہ مشہور ہوا۔ یہ بات کم دلچسپ نہیں کہ اس شعر کو مختلف مکتبۂ فکر کے لوگ اپنے اپنے طور پر پڑھتے اور استعمال کرتے رہے ہیں۔ شاعر نے منزلوں کے سہل ہو جانے اور ہوا کے رخ کے تبدیل ہو جانے کا سبب کسی کے ہاتھ کا ہاتھ میں آ جانا بتایا ہے۔ اس سے نہ تو کسی مخصوص سفر اور مسافر کا پتہ چلتا ہے اور نہ اس شخص کا جس کی ہم سفری چراغ راہ کے جل جانے کا وسیلہ بنی ہے۔ مسافر کا اصل رختِ سفر تو اس کا حوصلہ ہوتا ہے جو اسے دور اور دیر تک تازہ دم رکھتا ہے لیکن یہاں مجروحؔ نے اس روایتی لیکن اہم بات کو نظر انداز کرتے ہوئے جو بات کہی ہے وہ ہر شخص کے لیے باعث کشش و مسرت ہے۔ کلاسیکی غزل سے لے کر آج تک سفر اور اس کے متعلقات کو شعرا نے طرح طرح سے باندھا ہے یہ ایک مستقل مطالعے کا موضوع ہے۔ لہٰذا تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تمام اشعار مجروحؔ کی نظر میں رہے ہوں گے یہی وجہ ہے کہ یہاں مجروحؔ نہ تو کسی قسم کی غیر ضروری سجاوٹ کا اہتمام کرتے ہیں اور نہ ہی اپنے مضمون کو پیچیدہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بظاہر یہ سادہ سا شعر، ہمارے ذہن کو زندگی کے مختلف معاملات کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ ایک اچھے شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس کا

ہر قاری اپنے طور پر اس سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے اور ایک حوصلہ بھی پاتا ہے۔ اور اس کی آگہی و بصیرت میں اضافہ بھی ہوتا ہے' اس سیاق میں اگر مجروحؔ کے اس شعر کو دیکھئے تو مایوسی نہیں ہوگی۔ میں اس شعر کی معنوی تہوں پر زور نہیں دوں گا لیکن اس کی یہ خوبی کیا کم ہے کہ ہر مسافر اسے اپنے لیے پڑھتا اور گنگناتا ہے۔

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

لفظ ''ترا'' غزل کا مانوس محبوب بھی ہوسکتا ہے جو فطری طور پر ہرجائی' ضدی ہوتا ہے۔ لیکن مجروحؔ کے اس شعر میں جو محبوب ہے وہ عاشق کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور بالآخر چراغ راہ جل اٹھتے ہیں اگر کوئی ''ترا'' کو ان کے سماجی سروکار سے مشروط کر کے دیکھتا ہے تو اس میں مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اصل چیز شعری ہنرمندی ہے جو بہرحال مجروحؔ کے یہاں موجود ہے۔ ''ہوا'' اور ''چراغ'' میں ایک رعایت بھی ہے۔ جو ہوا' چراغ کو بجھاتی ہے اس کے نہ ہونے کے سبب چراغ جل بھی نہیں سکتا' گویا یہ ایک دوسرے کیلئے لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس کو ایک شاعر نے یوں کہا ہے۔

ساتھ اکیلے رہ سکے نہ بغیر اس کے رہ سکے یہ ربط ہے چراغ کا کیسا ہوا کے ساتھ

مجروحؔ کے اس شعر میں ہوا کے رخ کا بدل جانا مشکلوں کے دور ہوجانے کا اعلامیہ ہے۔ اور چراغ راہ کا جل جانا سفر کا آسان ہوجانا ہے۔ ان دو باتوں کو مجروحؔ نے جس سادگی لیکن ہنرمندی کے ساتھ یہاں پیش کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے

غزل کا یہ آخری شعر ہے۔ پہلے شعر میں شاعر نے منزلوں کے سہل ہوجانے اور ہوا کے رخ کے بدل جانے کو جس سیاق میں بیان کیا ہے غزل کے اس آخری شعر میں سفر کے تعلق سے ذرا مختلف بات کہی گئی ہے۔ سفر کی کاوشیں اور

گردشیں جو اکثر اوقات حوصلے کے ٹوٹ جانے کا سبب بنتی ہیں وہ آخرش مجروحؔ کے یہاں ایک روشن پہلو کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ ''بڑھیں اس قدر مری منزلیں'' اس جانب اشارہ ہے کہ گردشوں سے مسافر بھٹک بھی جاتا ہے اور لازماً منزل دور ہو جاتی ہے۔ یہاں منزلوں کے بڑھ جانے اور قدم کے خار کے نکل جانے کا ذکر کیا ہے۔ اس تناظر میں غالبؔ کا یہ شعر یاد آتا ہے۔

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

یہاں غالبؔ سے مجروحؔ کا تقابل کرنا مقصود نہیں ہے لیکن یہ ضرور دیکھا جا سکتا ہے کہ غزلیہ شاعری میں کسی پرانے اور برتے ہوئے مضمون کو برتنا کس قدر مشکل کام ہے۔ مجروحؔ کے شعر میں ایسا کوئی حسن نہیں جسے مجروحؔ کا شعری امتیاز قرار دیا جا سکے۔ بس اگر نگاہ ٹھہرتی ہے تو اس پر کہ شاعر نے خوش آہنگی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ آگئیں، کاوشیں، گردشیں، آخرش، منزلیں، بڑھیں یہ تمام ہم آواز الفاظ ہیں۔ نون غنہ اور شین کی تکرار سے ہماری سماعت متاثر ہوتی ہے اور خوش آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں منزلوں کے بڑھ جانے کا دوسرا پہلو ایک منزل کے بعد دوسری منزل کا سامنے آجانا بھی ہے، گویا مسافر نے کسی منزل کو آخری منزل نہیں سمجھا۔ اسی لیے وہ خوش ہے کہ اس کی کاوشوں اور گردشوں سے اس کے قدم کے خار نکل گئے۔ اس غزل میں مطلع سے آخری شعر تک مجروحؔ کی آواز کہیں بھی پھٹتی نہیں ہے۔ کوئی ایسا لفظ نہیں جسے غیر ضروری یا بھرتی کا کہا جا سکے یا اس کی جگہ پر کوئی دوسرا لفظ رکھا جا سکے۔ ہر دو مصرعے اس قدر مربوط اور برجستہ ہیں کہ کہیں دولخت ہونے کا گمان بھی نہیں گزرتا۔ یہ غزل متفاعلن کے وزن میں کہی گئی ہے متفاعلن کو عموماً مترنم بحر سمجھا جاتا ہے۔ اس غزل کا پہلا اور آخری شعر سفر سے متعلق ہے جس میں مجروحؔ کی روشن خیالی اور ترقی پسندی فنکارانہ حسن کے ساتھ سمٹ آئی ہے۔ غزل کے دوسرے اور تیسرے شعر میں محبوب کے تعلق سے جو جمالیاتی حسن ہے وہ کلاسیکی غزل کی مخصوص تہذیب سے آشنائی کا پتہ دیتا ہے۔ آج کی غزل مجروحؔ کے اس اسلوب سے گرچہ دور نکل آئی ہے لیکن جب کبھی مجروحؔ کے یہ اشعار سامنے آتے ہیں تو مجروحؔ کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔

وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں ڈھل گئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے

اس شعر سے لطف اندوز ہونے کے لیے ذہنی تربیت کی ضرورت ہے۔ ذہنی تربیت سے میری مراد کلاسیکی غزل کی شعریات سے آگاہی ہے۔ مجروحؔ نے دور جدید میں کلاسیکی رنگ میں غزل کہہ کر ادب کے طالب علموں کو کلاسیکی غزل کی طرف متوجہ بھی کیا ہے۔ مندرجہ بالا شعر کی تمام تر معنویت اس کے اسلوب میں پوشیدہ ہے۔ مجروحؔ نے ایک پامال اور بار بار کے آزمائے ہوئے مضمون کو یہاں باندھا ہے۔ لیکن مجروحؔ بظاہر دو متضاد باتوں کو ''وہی'' کی تکرار سے نہ صرف ہم آہنگ کر دیتے ہیں بلکہ ایک نامانوس سی سرسراہٹ کا احساس ہوتا ہے۔ جو بات زبان سے ادا نہ ہو سکی وہ شعر و نغمہ کا محرک بن کر اس میں آ گئی اور وہ لب جنہیں چھونے کی تمنا تھی وہ قدح شراب یعنی شراب کے پیالے میں ڈھل گئے۔ ''وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے'' سے کسی مجبوری کا پتہ چلتا ہے۔ نہ کہہ سکنے میں جو امکانات ہیں اس سلسلے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ دراصل پورے شعر کا یہی ٹکڑا شعر کے حسن کو بڑھاتا ہے۔ قدح شراب میں لبوں کا ڈھل جانا ایک احساس جمال ہے جس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شراب کے پیالے پر محبوب کے لب کا گمان ہی نہیں بلکہ یقین کر لینا دراصل غزل کی ایک پوری تہذیب کا اظہار ہے۔ اردو شاعروں نے اس مضمون کو طرح طرح سے باندھا ہے۔ ''لب'' کے تعلق سے جتنی باتیں ذہن میں آ سکتی ہیں ان سب کو مجروحؔ نے ''قدح شراب'' میں ڈھال دیا ہے۔ ''وہی بات'' کا تعلق شعر و نغمہ سے ہے اور ''وہی لب'' کا تعلق قدح شراب سے ہے لب کو چھونا محبوب سے قربت کا معاملہ ہے لیکن ''بات'' اور ''لب'' میں ایک دیرینہ تعلق بھی ہے۔

وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دل زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

اس شعر کو پڑھ کر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ شاعر کو ایک بدلی ہوئی صورتحال کا سامنا ہے۔ ایسے شعر سے مجروحؔ کے سیاسی و سماجی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہ بات عام طور پر کہی جاتی رہی ہے کہ ترقی پسند شاعروں نے ادب کے سماجی

سروکار پر کافی زور دیا ہے۔ مجروحؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ غزل کی اشاریت اور ایمائیت کے پردے میں اپنے زمانے کی بدلتی ہوئی صورتحال کو چھپانے میں کامیاب ہوئے۔ درج بالا شعر میں ''دل زار'' سے بھی بدلنے کا تقاضا دراصل اپنے عہد کی بدلی ہوئی زندگی اور اس کے مسائل کی جانب اشارہ ہے۔ بیشتر ترقی پسند شاعروں نے عشق کے روایتی اور رومانوی تصور سے نکل کر حقیقت اور انقلاب کی طرف آنے کی بات کہی ہے۔ مجروحؔ پہلے مصرعہ میں آستاں کے تعلق سے ''جبیں'' اور اشک کے تعلق سے ''آستیں'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ چار مرتبہ لفظ ''وہی'' سے شعر میں زور پیدا کیا گیا ہے لیکن ''وہی'' کی اس تکرار سے شعر مبتذل نہیں ہوتا۔ ''وہی'' سے ایک تحقیر کا پہلو بھی سامنے آتا ہے وہ یہ کہ سب کچھ بدل گیا لیکن ہم اب بھی پرانی ڈفلی بجا رہے ہیں۔ دل زار اگر نہیں بدلتا تو گویا وہ اپنے وقت کی حقیقتوں سے چشم پوشی کر رہا ہے۔

تجھے چشم مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم سے
تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

محبوب کی آنکھ کو نشیلی کہا جاتا ہے۔ نشے کی حالت میں آنکھ کی سرخی جس گرمی اور سوزش کا پتہ دیتی ہے اسے مجروحؔ کے مندرجہ بالا شعر سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وہ آنکھیں جو فطری طور پر نشیلی ہیں ان کا کیا کیا جائے۔ وہ تو بن پیے مست بھی رہتی ہیں اور دیکھنے والوں کو بھی مخمور رکھتی ہیں۔ عصر حاضر میں شہریار نے اپنے ایک شعر میں آنکھوں سے شراب پلانے کا ذکر کیا ہے۔

اک ہم ہی فقط مے کو آنکھوں سے پلاتے ہیں
کہنے کو تو دنیا میں میخانے ہزاروں ہیں

مجروحؔ نے ''تجھے چشم مست پتہ بھی ہے کہ'' کا ٹکڑا دونوں مصرعے میں استعمال کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے مصرعہ میں ''پتہ'' ہے اور دوسرے مصرعے میں ''خبر'' ہے۔ اب پہلے مصرعہ میں ''شباب گرمیٔ بزم ہے'' اور مصرعہ ثانی میں ''سب آبگینے پگھل گئے'' پر غور کیجیے۔ آبگینہ شیشہ اور کانچ کو کہتے ہیں۔ آبگینہ ایک نازک سی شئے ہے

جوذراسی ٹھیس لگنے سے ٹوٹ سکتی ہے۔ یہ شفاف شیشہ ہوتا ہے۔ اقبالؔ نے ایک جگہ آبگینے کو یوں استعمال کیا ہے۔

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
یہ چیز وہ ہے جو جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

شیشے میں شراب بھی ہوتی ہے۔ بزم کی گرمی اور اس کے شباب کا سبب محبوب کی چشم مست ہے اور اسی چشم مست کا اثر ہے کہ آبگینے پگھل گئے۔ آبگینے کا پگھل جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ ایک رکیک مادہ ہے جو ایک خاص درجۂ حرارت سے بنتا بھی ہے اور پگھلتا بھی ہے' اس طرف میرؔ نے اشارہ کیا ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کے نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

اس زمانے میں شیشہ گر نلکی میں سانس لیتا اور چھوڑتا تھا۔ ذراسی چوک سے شیشہ گر کی جان بھی جاسکتی تھی تو آبگینہ (شیشہ) اس طرح تیار ہوتا ہے۔ مجروحؔ کے شعر میں جو آبگینے پگھلتے ہیں وہ محبوب کی چشم مست کی گرمی سے۔ اس سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ محبوب کی آنکھ آبگینے کی جس شراب سے مست اور مخمور ہوئی وہی آنکھ اب اسی آبگینے کو پگھلانے میں لگی ہے' یہ ایک عبرت کا مقام ہے۔ اور دوسرا پہلو تو ہے ہی کہ محبوب کی مخمور و مست آنکھیں بزم کی گرمی کو بڑھا رہی ہیں اور آبگینے پگھل رہے ہیں۔ ''تجھے مست چشم پتہ بھی ہے'' کی تکرار سے مضمون میں زور پیدا ہوتا ہے' چشم مست چوں کہ بے خبر رہتی ہے اسی لحاظ سے ''پتہ بھی ہے'' ''خبر بھی ہے' بہت موزوں ہے۔ ''آبگینہ'' انسانی وجود کا استعارہ بھی ہوسکتا ہے۔ جس طرح آبگینہ نہایت نازک ہے اسی طرح انسانی زندگی بھی ہے۔ کلیم عاجزؔ نے جام وسبو کے ٹوٹنے کو پیاس نظر سے مشروط کردیا ہے۔

پیاسی نظریں اگر ہم اٹھاتے
کتنے جام و سبو ٹوٹ جاتے

آیئے اب مجروحؔ کی اس غزل کو ایک ساتھ پڑھ کر اس کے تاثر پر غور کرتے ہیں:

مجھے سہل ہوگئیں منزلیں وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ہاتھ میں آگیا کہ چراغ راہ میں جل گئے
مرے کام آگئیں آخرش یہی کاوشیں یہی گردشیں
بڑھیں اس قدر مری منزلیں کہ قدم کے خار نکل گئے
وہی بات جو نہ وہ کہہ سکے مرے شعر و نغمہ میں ڈھل گئی
وہی لب نہ میں جنہیں چھو سکا قدح شراب میں ڈھل گئے
وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دل زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے
تجھے چشم مست پتہ بھی ہے کہ شباب گرمیٔ بزم سے
تجھے چشم مست خبر بھی ہے کہ سب آبگینے پگھل گئے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. غزل کے مطلع میں ہوا کا رخ بدل جانا کس چیز کا اعلامیہ ہے؟
9. زیرِنظر غزل کس وزن میں کہی گئی ہے؟
10. آبگینہ کسے کہتے ہیں؟

8.6 مجروحؔ کی غزل اور اُس کی تشریح وتوضیح (2)

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

اردوشاعری میں جنوں اور خرد کا قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے۔ کلاسیکی شاعروں نے اس قصے کی پیش کش میں جو معنویت پیدا کردی ہے اس میں اب کسی طرح کی ندرت اور جدت مشکل سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات ادب کے ایک عام طالب علم کو بھی معلوم ہے کہ جنوں قربانی کا اعلامیہ ہے اور خرد مصلحت پسندی سے کام لیتی ہے۔ کسی مقصد کی حصولیابی کے لئے جنوں کا ہونا ضروری ہے۔ جنوں انسان کو جرأت رندانہ عطا کرتا ہے۔ مجروحؔ اس شعر میں بھی جلنے کا ہی ذکر کرتے رہے ہیں۔ جولوگ ان کے ہم سفر ہیں وہ ان کی نگاہ میں جنوں صفات ہیں' ان میں دیوانگی ہے مصلحت پسندی اور فرزانگی نہیں۔ اسی لئے انہوں نے جاں کی مشعل جلا رکھی ہے۔ پہلا مصرعہ جس قدر خوبصورت اور بامعنی ہے ثانی مصرعہ اس خوبصورتی اور معنویت کا ساتھ نہیں دیتا۔ مشعلِ جاں کو روشن کرنا جس دردمندی' دل سوزی سے عبارت ہے اور اس کے اظہار میں جو سلگنے اور تڑپنے کی کیفیت ہے وہ ثانی مصرعہ میں ''جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے'' کے اسلوب سے زائل ہو جاتی ہے گرچہ مشعل جاں کو شاعر نے گھر سے تشبیہ دی ہے اور 'گھر' اور 'جلا' میں ایک ربط بھی ہے لیکن مجروحؔ کو غالباً یہ فکر دامن گیر رہی ہوگی کہ شعر کے مضمون کو ایک بڑے اور اجتماعی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ مجھے کلیم عاجزؔ کا ایک شعر یاد آتا ہے۔

مشعلِ جاں روشن کرنے میں شام سویرا مت کرنا
جلنے کا جب وقت آجائے کوئی بہانہ مت کرنا

یہاں بھی ایک ترغیب اور دعوت ہے لیکن وہ ''جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے'' سے زیادہ پراثر ہے۔ ممکن ہے ادب کے کسی طالب علم کی نظر میں مجروحؔ کا یہ شعر اچھا ہو اور اس کی دلیل یہ پیش کی جائے کہ بعض موقعوں پر گفتگو کا وہی طریقہ زیادہ موزوں اور مناسب ہوتا ہے جو مجروحؔ کے اس شعر میں موجود ہے' اصل میں شعر کو پسند کرنے کا معاملہ اکثر اوقات ذاتی نوعیت کا ہو جاتا ہے لیکن ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے شعر کے فنی محاسن اور اس کے کمزور پہلوؤں کو نشان زد کرنا ضروری ہے۔ لہذا درج بالا شعر مجروحؔ کے بہت اچھے شعروں میں نہیں ہے۔ وہ بھی اس صورت میں جبکہ اس غزل میں مجروحؔ کا یہ لازوال شعر بھی موجود ہو۔

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کے ستم کی سیاہ رات چلے

گذشتہ چند برسوں میں مجروحؔ کا یہ شعر جس کثرت سے تحریروں اور تقریروں میں استعمال ہوا ہے وہ ایک واقعہ ہے۔ دار تختہ کو کہتے ہیں جہاں کسی کو پھانسی دی جاتی ہے یا قتل کیا جاتا ہے۔ دار و رسن کی ترکیب بھی استعمال کی جاتی ہے۔ لیکن مجروحؔ نے صرف 'دار' کو ہی استعمال کیا ہے۔ ستون دار اور سروں کے چراغ کی ترکیب بھی شاید مجروحؔ ہی کی اختراع ہے۔

رات یوں ہی ظلمت سے پہچانی جاتی ہے۔ عہد جدید میں فراقؔ نے رات کے حوالے سے بہت خوبصورت اشعار کہے ہیں۔ ان میں اپنے عہد کی حسیت کے ساتھ ساتھ عشق کا ایک نیا احساس بھی ہے۔ مجروحؔ کے اس شعر میں بات بالکل واضح اور متعین ہے۔ اس کی قرأت سے ہمارا ذہن ظلم و جبر کے ایک ایسے نظام کی طرف جاتا ہے جو مختلف زمانوں میں عام انسانوں کا مقدر رہا ہے۔ ''جہاں تلک کے ستم کی سیاہ رات چلے'' ظلم و جبر کے ختم نہ ہونے والے سلسلے کی جانب اشارہ ہے۔ سیاہ رات میں روشنی سروں کے چراغوں سے ہی ممکن ہے۔ اگر ستم کی سیاہ رات چلتی رہی تو ستون دار پہ سروں کے چراغ رکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ مجروحؔ کی ترقی پسندی اور ان کی سماجی وابستگی جب برہنہ گفتاری کا تقاضا کرتی ہے تو مجروحؔ اپنے بہترین لمحات میں غزل کے فن کو مجروح نہیں ہونے دیتے اور ساتھ میں گفتگو کا ایک ایسا توانا اور غیر مبہم لہجہ اختیار کرتے ہیں جس میں شاعری اور نظریے کا بہترین امتزاج ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر میں معنی کی کوئی طرفگی نہیں ہے لیکن سروں کے چراغ اور ستم کی سیاہ رات نے اسے مقبول خاص و عام بنا دیا ہے۔ ناصرؔ کاظمی کا یہ شعر دیکھئے۔

اس شہر بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شب فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

ناصرؔ کاظمی بھی شہر بے چراغ کا ذکر کرتے ہیں لیکن یہ ذکر صورتحال کی عکاسی تک محدود ہے جو ناصرؔ کاظمی کا

خاص اسلوب بھی ہے۔ مجروحؔ کا مسئلہ صورتحال کا بیان ہی نہیں بلکہ صورتحال کو بدلنے کی فکر بھی کرنا ہے۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں مجروحؔ کا یہ شعر زبان زد خاص و عام ہے۔ جو لوگ مجروحؔ کی ترقی پسندی پر زور دیتے ہیں ان کے نزدیک مجروحؔ کے ایسے ہی اشعار مجروح اور ترقی پسندی دونوں کے لیے نشانِ امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ مجروحؔ نے ایک شعر میں زخموں کے چراغ کی بات بڑے دلکش انداز میں کہی ہے۔

جاؤ تم اپنے بام کی خاطر، ساری لویں شمعوں کی کتر لو
زخم کے مہر و ماہ سلامت جشن چراغاں تم سے زیادہ

یہ غرور اور بانکپن مجروحؔ کا امتیاز ہے۔ مطلع کے شعر میں مجروحؔ مشعلِ جاں کو جلانے کی بات کرتے ہیں اور اس دوسرے شعر میں سروں کے چراغ سے سیاہ رات کو روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو مجروح کے یہاں روشنی اور تاریکی کا یہ سفر اور سلسلہ ان کے شعری سفر کا ایک اہم حوالہ بھی ہے، وہ روشنی اور تاریکی کے سیاق میں زندگی کے تلخ اور روشن پہلوؤں کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

دیار شام نہیں، منزل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

اس شعر کو پڑھیے تو ایسا محسوس ہوگا کہ زندگی ٹھہر سی گئی ہے۔ نہ تو شام ہوتی ہے اور نہ ہی سحر ہوتی ہے۔ شہریار نے ذرا مختلف انداز میں کہا ہے۔

یہ زمیں جیسے گھومتی ہی نہیں

مجروحؔ نے اس شعر میں زندگی کے جمود کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ نگر کون سا ہے۔ نہ دن چلے نہ رات چلے۔ اس سلسلے میں شاعر کا اپنا تجربہ اور مشاہدہ اسے ایک آفاقی صورت عطا کر دیتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ متکلم زندگی کے تحرک کے باوجود کسی اور تحرک کا خواہشمند ہو وہ کچھ اور توقع رکھتا ہو لیکن حالات نے اسے مایوس کیا، یعنی دن اور رات (شب و روز) کا سفر تو جاری ہے لیکن یہ سفر بھی کیسا ہے کہ پورا شہر خواب غفلت میں ڈوبا ہے۔ آج جب کہ زندگی کی رفتار اس قدر تیز

ہوگئی ہے ایسے میں مجروحؔ کا شعری تجربہ ہمیں اپنی دوڑتی بھاگتی زندگی کے بارے میں ایک نئے انداز میں سوچنے پر آمادہ کرتا ہے۔ نگر کی حد سے بڑھی ہوئی خاموشی کاروبار زندگی کے ٹھپ ہوجانے کا اعلامیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ مجروحؔ کے اس شعر میں وہ فنکارانہ حسن تو نہیں جو مجروحؔ کا امتیاز ہے لیکن ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

پھر آئی فصل کے مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

دیوانے کو زنجیر پہنانے اور زنداں میں ڈال دینے کی باتیں کلاسیکی غزل میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ دیوانے کو شہر راس نہیں آتا۔ لیکن صحرانوردی جو دیوانے کا مقدر ہے جب اس پر بھی پابندی عائد کی جائے تو دیوانہ کہاں جائے۔ میرؔ کا شعر ہے۔

کچھ موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی
شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی

مجروحؔ کے مندرجہ بالا شعر کی فضا میں بظاہر زنجیر، زنداں وغیرہ کا کوئی سراغ تو نہیں ملتا لیکن اس شعر کو سمجھنے کے لئے فصل بہار کے تمام تر لوازمات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ برگ آوارہ کی ترکیب بہت خوبصورت ہے۔ یعنی ایک ایسی پتی اڑ کر آئی ہے جس کی کوئی اپنی منزل نہیں یعنی اسے کہاں اور کس کے پاس جانا ہے پتہ نہیں لیکن اس میں ایک پہلو یہ موجود ہے کہ برگ آوارہ، دراصل اپنی آوارگی کے بعد جس کے پاس یا جدھر آئی ہے وہی اس کی اصل سمت اور رخ ہے۔ شعر کا متکلم اسی برگ آوارہ کو دیکھ کر گلوں کے موسم کی آمد کا نہ صرف خواب دیکھتا ہے بلکہ اسے یقین سا ہونے لگتا ہے کہ اب گلوں نے مجھے یاد کیا ہے اور مجھے گلشن کی طرف جانا چاہیے۔ برگ پیڑ کا پتہ ہے۔ پتے پر لکھنے اور تحریر کرنے کی روایت رہی ہے۔ ایک زمانے تک پتے ہی پر بعض اہم باتیں محفوظ کی جاتی تھیں۔ (شاعر) متکلم نے ان پتوں کو دیکھ کر ان حروف کو بھی دیکھا جو گلوں کی جانب سے لکھے گئے ہیں۔ یعنی برگ آوارہ متکلم یا شعری پیکر کے لئے مراسلات کا استعارہ ہے۔ ''پھر کوئی'' سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ اس سے پہلے بھی برگ آوارہ آچکی ہے۔

بلا ہی بیٹھے جب اہل حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لئے ایک صنم کا ہاتھ چلے

اس شعر کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ مجروحؔ نے پاکستان جاتے ہوئے کہا تھا۔ پاکستان کی رعایت سے اہل حرم اور ہندوستان کے ایک شہری ہونے کے ناتے صنم کا حوالہ دراصل مجروحؔ کی تخلیقی بصیرت کی ایک اعلیٰ مثال ہے۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس شعر کا محرک پاکستان کا سفر ہے تو بھی اہل حرم کے بلانے پر بغل میں صنم کا ہاتھ لے کر چلنا جس قدر موزوں اور خوبصورت ہے اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعروں نے ملا زاہد وغیرہ کا بہت مذاق اڑایا ہے اور تسبیح و زنار میں ایک وحدت کے رشتے کو بھی قائم کرنے اور تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اشرف علی خاں فغاںؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے
پس چاہئے تسبیح میں زنار نہ ہونا

مجروحؔ نہ تو زاہد اور قاضی کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہ ہی تسبیح و زنار میں کسی قسم کے رشتے کے متلاشی ہیں وہ تو اہل حرم کے بلانے پر خوش ہیں کہ انہیں اہل حرم نے بلایا اور وہ اپنی عشقیہ روایت کے ساتھ وہاں گئے۔ ''بلا ہی بیٹھے'' سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اہل حرم سے نہ تو توقع تھی اور نہ ہی وہ اس کے خواہشمند تھے۔ بلکہ جب انہیں کوئی عذر نہیں تو ہم نے بھی اپنے صنم کو اپنا ہم سفر بنایا۔ شعر کو پڑھیے تو ایک جیتا جاگتا چلتا پھرتا پیکر سامنے آجاتا ہے۔ بغل میں صنم کا ہاتھ لے کے چلنا ایک جمالیاتی احساس سے ہمیں دوچار کرتا ہے۔ صنم تو محبوب کو کہتے ہیں لیکن مجروحؔ نے یہاں اہل حرم کی رعایت سے اسے ایک دوسری جہت بھی عطا کر دی ہے۔ حرم میں صنم کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے لیکن یہ ہمت اور حوصلے کی بات ہے کہ وہاں صنم کے ساتھ جایا جائے۔ اصل میں یہ سب باتیں شعر کی تفہیم کے سلسلے میں پیش کی گئیں ہیں لیکن اصل بات تو وہ لطف کا پہلو ہے جو اہل حرم اور صنم سے پیدا ہوتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں ''بلا ہی بیٹھے'' اور ثانی مصرعہ میں ''ہم بھی'' سے شعر میں زور پیدا ہوتا ہے۔ ''ہی'' اور ''بھی'' جیسے چھوٹے الفاظ سے مجروحؔ بھی بڑے کام

لینے کا فن جانتے ہیں۔

اب آیئے مجروحؔ کی اس غزل کو تسلسل کے ساتھ پڑھتے ہیں:

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کے ستم کی سیاہ رات چلے

دیار شام نہیں، منزل سحر بھی نہیں
عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے

پھر آئی فصل کے مانند برگ آوارہ
ہمارے نام گلوں کے مراسلات چلے

بلا ہی بیٹھے جب اہل حرم تو اے مجروحؔ
بغل میں ہم بھی لئے ایک صنم کا ہاتھ چلے

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

11. شاعر نے مشعل جاں کو کس سے تشبیہ دی ہے؟

12. فراقؔ نے کس کے حوالے سے بے حد خوبصورت اشعار کہے ہیں؟

8.7 خلاصہ

اسرار حسن خاں مجروحؔ اتر پردیش کے ضلع سلطان پور کے باشندے تھے۔ ان کی ولادت یکم اکتوبر 1919ء کو اعظم گڑھ کے قصبے نظام آباد میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم عربی، فارسی و اردو کی ہوئی۔ بعد میں انہوں نے طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی اور مطب قائم کیا۔ شعر گوئی کا آغاز ہو چکا تھا۔ 1945ء میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے ممبئی

گئے اور فلمی دنیا میں نغمہ نگاری سے وابستہ ہو گئے۔ پھر یہیں کے ہو رہے اور باقی عمر فلموں میں گیت لکھنے میں گزار دی۔ 24 مئی 2000ء کو ایک بھرپور زندگی گزار کر ممبئی میں مجروحؔ کا انتقال ہو گیا۔

مجروحؔ کا پہلا شعری مجموعہ غزل کے عنوان سے 1953ء میں شائع ہوا۔ یہی مجموعہ ترمیم واضافے کے ساتھ 1999ء میں ''مشعل جاں'' کے نام سے شائع ہوا۔ فلموں میں مجروحؔ کے گراں قدر تعاون کے لیے انہیں اس دنیا کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی اعزازات دیے گئے۔

مجروحؔ اپنے عہد کے ایک مقبول شاعر رہے ہیں۔ جب غزل ترقی پسندوں کے مسلسل حملوں کا شکار ہو رہی تھی اسی وقت ترقی پسندوں کی صف سے ہی فیضؔ اور مجروحؔ جیسے شاعروں نے غزل کا دفاع کیا۔ مجروحؔ نے غزل کی کلاسیکی روایات کا احترام کیا اور تغزل سے اپنی غزل کا رشتہ برقرار رکھا۔ غزل کی جمالیاتی حس ہمیں مجروحؔ کے زیادہ تر اشعار میں ملتی ہے۔ عصری حسیت بھی ان کے کلام میں ہے مگر اسے راست بیانیہ کی شکل میں تلاش کرنا درست نہ ہوگا۔ دراصل وہ استعاروں اور کنایوں کے مزاج شناس ہیں اور انہیں کے ذریعہ اپنی بات کہتے ہیں۔ مجروحؔ نے غزل کے تمام تر تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ غزل کی مکمل تہذیب مجروحؔ کی غزلوں میں سمٹ آئی ہے۔

شامل نصاب دونوں غزلیں مجروحؔ کے مخصوص غزلیہ لہجے اور مزاج کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان میں واردات قلبیہ کا بھی ذکر ہے اور خارجی عوامل کا بیان بھی داخلیت کے حوالے سے کیا گیا ہے۔ نازک احساسات و جذبات بھی پائے جاتے ہیں اور عاشقانہ تمکنت کی حدت کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مجروحؔ چونکہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن سے بھی متعلق تھے اور اشتراکیت سے وابستگی رکھتے تھے اس لیے ان کے نظریات وافکار کا بھی اظہار ان غزلوں میں ہوا ہے مگر ان کی حیثیت موج تہہ نشیں کی سی ہے۔ بحیثیت مجموعی مجروحؔ کی یہ غزلیں ان کے مخصوص شعری مزاج کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔

8.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. نصاب میں شامل غزل نمبر (1) کے کسی ایک شعر کی تشریح کیجیے۔

2. غزل نمبر (2) کی اہم خصوصیات مختصراً تحریر کیجیے۔

3. فلموں سے مجروحؔ کی وابستگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. مجروحؔ کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

2. مجروحؔ کی غزل گوئی کی اہم خصوصیات بیان کیجیے۔

3. مجروحؔ کے درج ذیل اشعار کی تشریح کیجیے:

(الف) وہی آستاں ہے وہی جبیں وہی اشک ہے وہی آستیں
دل زار تو بھی بدل کہیں کہ جہاں کے طور بدل گئے

(ب) ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک کہ ستم کی سیاہ رات چلے

8.9 فرہنگ

آخرش	آخرکار
کاوشیں	محنت، تلاش وجستجو، کاوش کی جمع
قدح شراب	شراب کا پیالہ
آبگینے	شیشہ، کانچ

8.10 معاون کتابیں

1. گلکاریِ وحشت کا شاعر مجروحؔ : ڈاکٹر خلیق انجم

2. غزل : مجروحؔ سلطان پوری

8.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. مجروحؔ ضلع اعظم گڑھ کے قصبے نظام آباد میں یکم اکتوبر 1919ء کو پیدا ہوئے۔
2. کیونکہ مدرسے کے ایک مدرس سے ان کا جھگڑا ہو گیا تھا اور انہیں مدرسے سے ہٹا دیا گیا۔
3. مجروحؔ نے پہلی بار اے۔آر۔کاردار کی فلم ''شاہ جہاں'' میں گانے لکھے۔
4. مجروحؔ کا مجموعہ کلام پہلی بار ''غزل'' کے نام سے شائع ہوا۔
5. انہیں فلمی دنیا کا سب سے بڑا اعزاز دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا گیا۔
6. مجروحؔ کا درج ذیل شعر بیسویں صدی کے نصف آخر کی شناخت بن گیا:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

7. جب کلاسیکی غزل سے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں تو غزل غزل نہیں رہتی۔
8. ہوا کا رخ بدل جانا مشکلوں کے دور ہو جانے کا اعلامیہ ہے۔
9. یہ غزل متفاعلن کے وزن میں کہی گئی ہے۔
10. آبگینہ شیشے یا کانچ کو کہتے ہیں۔
11. شاعر نے مشعلِ جاں کو گھر سے تشبیہہ دی ہے۔
12. فراقؔ نے رات کے حوالے سے بے حد خوبصورت اشعار کہے ہیں۔

اکائی 7 : عزیزؔ لکھنوی

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 حیات

9.4 عزیزؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

9.4.1 غالبؔ کا طرز

9.4.2 تخیل آفرینی

9.4.3 سہل ممتنع

9.4.4 معنی آفرینی

9.5 عزیزؔ لکھنوی کی غزل (1)

9.5.1 مجموعی تاثر

9.5.2 غزل کی تشریح

9.6 عزیزؔ لکھنوی کی غزل (2)

9.6.1 مجموعی تاثر

9.6.2 غزل کی تشریح

9.7 خلاصہ

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

9.9 فرہنگ

9.10 معاون کتابیں

9.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

9.1 اغراض ومقاصد

ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ یہ خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کرتا ہے۔ ادب میں انسانی زندگی کی تصویر اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی جذبات و احساسات کے ساتھ ساتھ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ شاعر یا ادیب کا تعلق سماج اور کسی ایک ملک سے ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا اس سماج کی رسموں کا، تہذیب کا اثر لازم ہے کہ ادب پر پڑے۔ چوں کہ شاعری بھی اظہار کا ایک ذریعہ ہے اس لیے طلبہ میں اس کا ذوق وشعور پیدا کرنے، ان میں شعرفہمی کو ابھارنے کے لیے شاعری کا درس دیا جاتا ہے۔ اس کے مطالعے سے طلبہ میں نہ صرف شعری ذوق پیدا ہوتا ہے بلکہ ان میں اپنی تہذیب اور زبان سے ایک لگاؤ پیدا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی وہ زبان کی باریکیوں، لفظوں کے رکھ رکھاؤ اور شعری محاسن سے بھی واقف ہوتے جاتے ہیں۔

دبستان لکھنؤ کی خدمات اردو شاعری کے تعلق سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ کمیوں کے ساتھ ساتھ خوبیاں بھی ہیں۔ ان کمیوں سے الگ اس کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس کو اردو زبان کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور وہ ہے اصلاحِ زبان۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میرؔ اور سوداؔ کے زمانے میں زبان کی اصلاح کا کافی کام ہوا تھا اس کے باوجود بہت سے نامانوس الفاظ کا استعمال ہورہا تھا۔ ان سب کی اصلاح کا سہرا ناسخؔ کے سر ہے۔ انہوں نے زبان کے قاعدے مقرر کیے اور ان پر خود بھی عمل کیا اور شاگردوں سے بھی اس پر کاربند رہنے کی ہدایت کی۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنوی دبستان کے شعرا کی زبان نہایت صاف ستھری اور رواں ہوتی ہے۔ عزیزؔ لکھنوی کا تعلق بھی اسی دبستان سے ہے۔ جن کا مطالعہ ہم یہاں کرنے جارہے ہیں۔ لہٰذا اس اکائی کے مطالعے سے آپ دبستان لکھنؤ کی شعری خصوصیات سے بالواسطہ طور پر واقف ہوجائیں گے کیونکہ عزیزؔ لکھنوی کے کلام میں اس دبستان کے شعری معیارات کی پاسداری مکمل طور پر نظر آتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بحیثیت ایک شاعر عزیزؔ لکھنوی کا کیا مقام ومرتبہ ہے اس سے بھی آپ روشناس ہوں گے کیونکہ ہر شاعر کی اپنی طبعی وفطری جہت بھی ہوتی ہے اور وہ کسی خاص صف میں شامل ہونے کے باوجود اپنا انفرادی آہنگ بھی رکھتا ہے۔

9.2 تمہید

شاعری وفورِ جذبات کے بے اختیار بہہ نکلنے کا نام بھی ہے اور نغمۂ الہام بھی۔ یہ زندگی اور حالات کی روشن تفسیر بھی ہے اور تفریح طبع کا سامان بھی۔ یہ ہمارے کانوں میں رس ہی نہیں گھولتی بلکہ دلوں پر اثر انداز ہو کر فکر و احساس کو ایک خوشگوار کیفیت بھی عطا کرتی ہے۔ ادب حقیقتاً زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے اور اس میں خارجی حقیقتوں کو داخلی آئینے میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں انسانی زندگی کی تصویر اس طرح پیش کی جاتی ہے کہ اس میں انسانی جذبات واحساسات کے ساتھ ساتھ مشاہدات، تجربات اور خیالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

اردو شاعری کی سب سے مقبول صنف سخن کا نام غزل ہے۔ غزل جسے کبھی اردو شاعری کی آبرو کہا گیا تو کبھی ناپاک دفتر مگر اس نے ہمیشہ وقت کا ساتھ دیا اور وقت ہی نے یہ ثابت کیا کہ جو خوبی غزل میں ہے، وہ دوسری کسی صنف ادب میں نہیں۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جب غزل کو ترقی پسندوں نے تنقید کا نشانہ بنایا تو حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ گونڈوی اور جگرؔ مرادآبادی نے اسے ایک نئی قوت عطا کی۔ عزیزؔ لکھنوی کا تعلق بھی اسی عہد سے ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ انہوں نے غزل کی آبیاری کہاں تک کی۔

9.3 حیات

عزیزؔ لکھنوی کا پورا نام محمد ہادی اور عزیزؔ تخلص ہے۔ ان کی ولادت 1882ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے اجداد کا وطن شیراز (ایران) تھا۔ علم و فضل خاندان میں موروثی تھا۔ عزیزؔ کی عمر ابھی سات سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن فطری شوق نے علم حاصل کرنے سے منھ نہ موڑنے دیا اور مطالعہ کا شوق ہمیشہ قائم رہا۔ اساتذہ کے دواوین اور کتب سے ان میں شاعری کا ذوق پروان چڑھا۔ غالباً طالب علمی کے ہی زمانے میں شاعری کا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ شاعری کی ابتدا فارسی سے ہوئی مگر بہت جلد اردو میں شعر کہنے لگے اور اصلاح سخن کے لیے صفیؔ لکھنوی سے مشورہ کرتے تھے۔ بہت ہی کم عرصے میں ان کے شاگردوں میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی۔ عزیزؔ لکھنوی کا شمار اردو کے ان چند شعرا میں ہوتا ہے جنہوں نے جدید دور میں غزل کی نوک پلک سنوارنے کی کوششیں کیں۔

ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ''گل کدہ'' کے عنوان سے 1919ء میں پہلی بار اور 1931ء میں تیسری بار شائع ہوا۔ 1919ء کے بعد کی تخلیقات ان کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ''انجم کدہ'' اور ''قصائد عزیز'' ان کے دو مجموعے اور شائع ہوئے۔ عزیؔز لکھنوی نے ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ گوئی میں بھی آپ کا پایہ کافی بلند ہے لیکن ان کی اصل قدر و منزلت غزلوں کی وجہ سے ہی ہے۔ علامہ اقبال ''گل کدہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بہ نظر استفادہ دیکھتا ہوں۔

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں! موجودہ ادبیات اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعۂ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔''

(گل کدہ۔ صفحہ 12، 1931ء)

عزیؔز لکھنوی کے مراسم مرزا محمد عباس علی خاں جگر سے بڑے خاص تھے۔ یہ ڈپٹی کمشنر اور رئیس اعظم لکھنؤ تھے۔ سات آٹھ سال تک ان کے خاص معتمد رہے اور جگر کو اصلاح سخن دیتے رہے۔ اس کے بعد امین آباد ہائی اسکول میں فارسی مدرس کے طور پر فرائض انجام دیتے رہے۔ 1928ء میں راجہ صاحب محمود آباد نے طلب کر لیا اور ولی عہد کا استاد مقرر کر دیا۔ اس طرح زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اردو ادب کا یہ ستارہ 1935ء میں غروب ہو گیا۔

ویسے تو ان کے شاگردوں کی تعداد کافی ہے مگر ان کے مخصوص شاگردوں میں مرزا جعفر علی خاں اثرؔ، شبیر حسن خاں جوشؔ، جگت موہن لال رواںؔ اور حکیم سید علی آشفتہؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. عزیؔز لکھنوی کا اصل نام کیا ہے؟
2. عزیؔز کے استاد گرامی کون تھے؟
3. عزیؔز کے پہلے شعری مجموعے کا نام بتائیے۔

5.4 عزیزؔ لکھنوی کی شاعرانہ خصوصیات

جس طرح ہر شخص کا ایک فطری میلان ہوتا ہے اسی طرح شاعر کا بھی ہوتا ہے۔ کسی کو تخیل آفرینی سے لگاؤ ہوتا ہے تو کسی کو معنی آفرینی سے۔ اسی طرح کسی کو فلسفے سے شغف ہے تو کسی کو سادگی و پرکاری یا استفہام سے۔ لیکن یہ کبھی ضروری نہیں ہے کہ شاعر اپنے آپ کو کسی ایک دائرے تک محدود رکھے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ طبیعت کا جھکاؤ جس طرف ہوتا ہے، رفتہ رفتہ وہ رنگ غالب ہونے لگتا ہے۔ یہی خاص رنگ آگے چل کر شاعری کی انفرادیت قائم کرنے میں معاون ہوتا ہے۔

عزیزؔ نے غزل، مرثیہ، قصیدہ، رباعی اور نظم میں اپنی شاعری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ ان کے قصائد کا مجموعہ ''صحیفۂ ولا'' اور ادبی، اصلاحی، قومی، مذہبی نظموں کا مجموعہ ''نالۂ جرس'' ہے۔ اس سے ان کی جولانی طبیعت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ''گل کدہ'' اور ''انجم کدہ'' کے مطالعے سے پہلی نظر میں جو بات ذہن میں آتی ہے وہ ہے غالبؔ کا اثر۔ اس لیے سب سے پہلے اسی رنگ کی بات کی جاتی ہے۔

9.4.1 غالبؔ کا طرز

عزیزؔ لکھنوی نے کلام غالب کا مطالعہ خاص طور سے کیا تھا اور اسی رنگ کو اپنے لیے اختیار کیا۔ غالبؔ کی پیروی میں نہ صرف نئے مضامین، خیالات اور اسلوب بیان اختیار کیا بلکہ ان کی زمینوں میں کثرت سے غزلیں کہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عزیزؔ کو بھی استفہام سے کافی دلچسپی تھی جو کہ غالبؔ کا ایک خاص رنگ ہے۔ ملاحظہ ہو:

شرح جانکاہی عشق ایک غیر ممکن بات ہے — کاٹ کر لانا بہت آساں تھا جوئے شیر کا
بعد میرے میرا ساماں سب تبرک ہوگیا — حلقہ حلقہ بٹ رہا ہے اب مری زنجیر کا

وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگ جاں ہوگئیں — دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہوگئیں
اک نظر گھبرا کے کی اپنی طرف اس شوخ نے — ہستیاں جب مٹ کے اجزائے پریشاں ہوگئیں

اگر کچھ ہم کو امید اثر ہوتی تو کیا ہوتا؟ ہماری آہ کوئی کارگر ہوتی تو کیا ہوتا؟
کیے ہیں ملک حسن وعشق میں برپا یہ ہنگامے خدائی تیرے قبضے میں اگر ہوتی تو کیا ہوتا؟

حسن بے پردہ ہے یارب کیا ہی غیرت آفریں پانی پانی ہوگیا ہے آئینہ تصویر کا

کسی کے وعدے پر اتنا جو انتظار کیا ارے یہ کون سا دل تھا کہ اعتبار کیا

اوپر درج کیے گئے اشعار سے یہ بات بالکل صاف ہوجاتی ہے کہ عزیزؔ پر غالبؔ کا اثر بہت زیادہ تھا۔انہوں نے نہ صرف غالبؔ کا رنگ اپنانے کی کوشش کی بلکہ ان کی زمینوں میں غزلیں بھی کہی ہیں۔دیوان کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بعض غزلیں غالبؔ کو سامنے رکھ کر کہی گئی ہیں۔عزیزؔ کا یہ خاص رنگ ہے جو ان کی شاعری پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔مرزا جعفر حسین، عزیزؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

''عزیزؔ مرحوم تمام شعرائے سابقین میں سب سے زیادہ مرزا غالبؔ سے متاثر تھے
اور دلی کے رنگ سخن کو قبول کرنے کی انہوں نے کامیاب کوشش کی تھی۔''

9.4.2 تخیل آفرینی

عزیزؔ کی شاعری کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں معنی آفرینی، تخیل آفرینی کا خاص ملکہ حاصل تھا۔ شاعری میں ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ شاعر کوئی نیا مضمون، نیا خیال لے آئے۔تخلیق کار انہیں خیالات کو جو نظم کیے جا چکے ہیں ایک نئے طرز سے نظم کر کے اپنی تخیل آفرینی، فکر کی بلندی کی داد چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ کبھی دو مماثل چیزوں میں فرق تو کبھی دو متفرق چیزوں میں مماثلت دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔مثال کے طور پر عزیزؔ کے اشعار درج ذیل ہیں:

سوز غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا
الحذر اب دور مجھ سے بیٹھتا ہے چارہ گر زخم پر رکھنے نہ پایا تھا کہ پھاہا جل گیا

کسی نے نزع کی اس طرح گتھیاں سلجھائیں　　سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا

آگے خدا کو علم ہے کیا جانے کیا ہوا ؟　　بس ان کے رخ سے یاد ہے اٹھنا نقاب کا

اڑے وہ طور کے پرزے گرے وہ حضرت موسیٰ　　اثر تم نے بھی دیکھا کچھ تبسم ہائے پنہاں کا

ہر گل میں تو ہے تجھ میں ہزاروں تجلیاں　　دیوانہ کردیا مجھے فصل بہار نے

جو یہاں محو ماسوا نہ ہوا　　دور اس سے کبھی خدا نہ ہوا

اک نگہ نے تیری طے کی صورت امید وبیم　　سارا جھگڑا مٹ گیا تدبیر اور تقدیر کا

وہی ہمارے لیے پھول ہیں تر و تازہ　　قفس میں خون کے آنسو اگر رلائے بہار

اشعار اور بھی نقل کیے جاسکتے ہیں کیوں کہ اس طرح کے اشعار ہر صفحے پر ''گل کدہ'' میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ رنگ غالبؔ ہو کہ تخیل آفرینی ان کی مثالیں کسی بھی غزل میں مل سکتی ہیں۔

9.4.3 سہل ممتنع

اس کے علاوہ ان کے کلام کی ایک اور خصوصیت ہے وہ ہے سہل ممتنع۔ سہل ممتنع اس وقت ہوتی ہے جب شعر میں کوئی مشکل لفظ استعمال نہ کیا گیا ہو اور شعر کی نثر بنانا مشکل ہو جائے یعنی شعر کی عبارت نثر سے قریب ترین ہو مثلاً

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟　　آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

غالبؔ

عزیزؔ کی شاعری میں اس کی مثالیں بے شمار ہیں۔ اتنے سیدھے سادے، عام فہم زبان میں ایسی مضمون آفرینی کم شعرا کے حصے میں آتی ہے، جیسا کہ عزیزؔ لکھنوی کے کلام میں دیکھنے میں آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

تم نے چھیڑا تو کچھ کھلے ہم بھی　　بات پر بات یاد آتی ہے

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی　　اب تو دن رات یاد آتی ہے

عزیزؔ اس قدر ہم نے سجدے کیے　　خدا ان کو آخر بنا ہی دیا

سبق آ کے گورِ غریباں سے لے لو　　خموشی مدرس ہے اس انجمن میں

جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو　　ایسی میت پہ کون روتا ہے
سانس بیمار کی اکھڑتی ہے　　آج قصہ تمام ہوتا ہے

دل نے اک بات نہ مانی میری　　مٹ گئی ہائے جوانی میری

اے مرا حال پوچھنے والے　　تجھ کو اب تک مری خبر نہ ہوئی
ہم اسی زندگی پہ مرتے ہیں　　جو یہاں چین سے بسر نہ ہوئی
ہجر کی رات کاٹنے والے　　کیا کرے گا اگر سحر نہ ہوئی

سہل ممتنع کے تعلق سے اب تک جتنے اشعار نقل کیے گئے ان سے یہ اندازہ بآسانی کیا جاسکتا ہے کہ اس قدر عام فہم زبان میں ایسے مضمون نظم کرنا آسان نہیں لیکن عزیزؔ اس طرح ایسے مضمون باندھتے چلے جاتے ہیں کہ احساس نہیں ہوتا کہ اس قدر سہل زبان میں اتنے بلند مضامین کیوں کر نظم ہو سکتے ہیں۔ یہی عزیزؔ کی شاعرانہ خصوصیت ہے۔

9.4.4 معنی آفرینی

شاعری کی خصوصیات کے سلسلے میں اب تک ہم نے تین خصوصیات کا ذکر کیا ہے اور آخر میں اب معنی آفرینی پر گفتگو کر کے یہ سلسلہ ختم کیا جائے گا۔ معنی آفرینی کی مثالیں جو ایک نظر میں سامنے آئیں وہ درج کی جاتی ہیں:

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا
نور جل جائے ابھی چشمِ تماشائی کا

اف ترے حسن جہاں سوز کی پرزور کشش
نور سب کھینچ لیا چشمِ تماشائی کا

.....

زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں
مصیبت دل کی کیا کم ہے بلائے آسماں کیوں؟

.....

سوزِ غم سے اشک کا ایک ایک قطرہ جل گیا
آگ پانی میں لگی ایسی کہ دریا جل گیا!

.....

اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

.....

کردیا دل نے زندۂ جاوید
قید ہستی سے میں رہا نہ ہوا

.....

بقدر جوشِ جوانی بڑھا غرور ان کا
کہ مے نے نشہ باندازۂ خمار کیا

.....

اچھا ہوا کہ جلد یہ برباد ہوگیا
اتنے سے دل میں ساری خدائی کا درد تھا

درج بالا اشعار سے آپ کو خود ہی معنی آفرینی کی تعریف کا اندازہ ہورہا ہوگا۔ جب شاعر لفظوں کو ایک نئے معنی دیتا ہے یا معمولی لفظوں سے غیر معمولی کام لیتا ہے اور قاری اس کے فن کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا تو اسے معنی آفرینی کہتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

4. عزیزؔ کے کلام سے غالبؔ کے رنگ کا ایک شعر درج کیجیے۔

5. تخیل آفرینی کسے کہتے ہیں؟ مثال کے ساتھ سمجھائیے۔

6. سہل ممتنع کے اشعار نقل کیجیے اور تعریف بھی بیان کیجیے۔

9.5 عزیزؔ لکھنوی کی غزل (1)

شمع بجھ کر رہ گئی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حسن و عشق اک داغ دل پر رہ گیا
ضعف میں کرتا بیاں کس طرح آخر دردِ دل
آپ کا بیمار اک کروٹ بدل کر رہ گیا
شوق نے کہہ کے یہ پہنچایا آخر قبر تک
دو قدم بس اور آگے کوئے دل بر رہ گیا
چارہ سازوں سے دمِ آخر ترا بیمارِ غم
دل کی جانب کچھ اشارے سے بتا کر رہ گیا
قطرہ قطرہ اشک کا ہے مخبر ناسور دل
ہم کو اب رونا اسی کا زندگی بھر رہ گیا

9.5.1 مجموعی تاثر

عزیزؔ لکھنوی کی غزل گوئی کی یہ ایک خاص بات ہے کہ اس دور میں جب کہ غزل کے مقابلے نظم کو زیادہ سراہا جارہا تھا' اس وقت اس طرح کی شاعری جس میں صرف وارداتِ قلبیہ اور حسن و عشق کو اپنا محور بنائے رکھنا اور زمانے کے حادثات و واقعات' ساتھ ہی خارجی مضامین کا اثر نہ ہونا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ یہ وہ عہد ہے جب کہ علامہ

اقبال ''نیا شوالہ''، ''کوہِ ہمالہ'' اور چکبست ''ہوم رول'' جیسی نظمیں کہہ رہے تھے۔عزیز اس وقت بھی اپنی دنیا میں مست' دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حسن وعشق کے معاملات نہایت خوبی سے نظم کررہے تھے۔عزیز کی مندرجہ بالا غزل 13 اشعار پر مشتمل ہے اور تمام کے تمام اشعار اسی حسن کی جفا شعاری اور عشق کی وفا شعاری اور دلی کیفیات کے مضمون پر مشتمل ہیں۔

9.5.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: اس شعر میں شاعر یہ کہنا چاہ رہا ہے کہ عشق کی آگ نے آخر کار دونوں کو یعنی حسن اور عشق کو جلا کر خاک کردیا۔اردو شاعری میں شمع و پروانہ اور گل وبلبل حسن اور عشق کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔ٹھیک ویسے ہی جیسے شام دکھ اور مصیبت کی اور صبح خوشی کی' ایک نئی امید کی علامت بن چکے ہیں۔شعر کے پہلے مصرعہ میں شمع اور پروانہ کے جلنے سے مراد' ان کا حقیقی آگ میں جلنا نہیں ہے بلکہ عشق کی وہ آگ جو دل میں ہوتی ہے اس نے دونوں کو جلا دیا مگر ان کی یادگار کے طور پر دل پر اک داغ رہ گیا یعنی ان کے خاک ہوجانے' جل جانے کے باوجود' ان کے دلوں پر عشق کا ایک نشان باقی رہ گیا۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ عشق وہ حقیقی جذبہ ہے جو کہ زمانے کے لاکھ ستم کے باوجود باقی رہتا ہے۔ حسن وعشق کا وصال نہ ہوا تو کیا؟ اب بھی دونوں کے دلوں پر اک نشانِ عشق باقی رہ گیا ہے۔یعنی عشق کبھی بھی مٹ نہیں سکتا۔

دوسرا شعر: اردو غزل کا عاشق ہمیشہ کمزور' ناتواں' نحیف' ضعیف اور لاغر ہوتا ہے لیکن یہ کمزوری اور ناتوانی خدا کی دی ہوئی نہیں ہے بلکہ عشق میں جلتے جلتے عاشق کی حالت یوں ہوجاتی ہے اس شعر میں معاملہ یہ ہے کہ عاشق اس قدر کمزور ہوچکا ہے کہ اس میں بولنے کی ہمت وطاقت نہیں رہ گئی ہے لہٰذا دردِ دل کو بتانے کے لیے اس نے ایک کروٹ لی اور دل کا حال ان پر ظاہر کردیا کہ اسی کی وجہ سے اس کا یہ حال ہوا ہے ورنہ وہ ایسا کبھی نہ تھا۔

تیسرا شعر: شاعر کہتا ہے کہ اپنے محبوب سے ملنے کے شوق نے اسے تمام کردیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عاشق نے پوری عمر اسی فراق میں گزار دی کہ آج نہیں تو کل وصال ہو ہی جائے گا' آج نہیں آئے ہیں مگر کل کی

ملاقات کا وعدہ کیا ہے تو کل آئیں گے ہی۔ اسی آج کل' آج کل میں پوری عمر گزر گئی لیکن محبوب سے ملاقات کا موقع نہ آیا۔ اس شعر میں ''کوئے دل بر'' بڑی ہی خوبی سے ایک نئے معنی میں باندھا گیا ہے۔ ''کوئے دل بر'' سے یہاں مراد محبوب کی گلی نہیں بلکہ اس کا التفات ہے۔ محبوب سے التفات کی چاہت میں عمر ختم ہوگئی مگر وہ اپنی کافراداؤں اور جفا شعاری سے باز نہ آیا اور ایک عمر کی وفا پرستی پر بھی اسے یقین نہ آیا۔

چوتھا شعر: عاشق نے پوری عمر اپنے محبوب سے اپنی وفا کا انعام حاصل کرنے کے لیے گزار دی لیکن اسے اس کا التفات حاصل نہیں ہوسکا۔ آخر کار اسی میں آخری وقت بھی آ پہنچا ایسے میں معالج اور تیمارداروں سے عاشق اپنی بیماری' درد اور کرب کے بارے میں کمزوری کے باعث کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے بس اشارے سے دل کی طرف اک نگاہ کردی اور اسی اشارے نے اس کے دل کا حال چارہ سازوں پر ظاہر کردیا۔ کیا بیماری ہے؟ کہاں تکلیف ہے؟ اس کا ایک ہی جواب اس نے اشارے سے دیا کہ اسی دل نے اسے یہاں تک پہنچا دیا۔ اسی کی وجہ سے اسے زندگی بھر کبھی سکون نہ حاصل ہوسکا۔ اس شعر میں ''بتا کر رہ گیا'' میں ''رہ گیا'' خاص توجہ کا طالب ہے یہی اس شعر کا کلیدی لفظ ہے۔

پانچواں شعر: عشق کے ہاتھوں' عاشق کا اب یہ حال ہو چکا ہے کہ وہ خون کے آنسو روتا ہے۔ اب تک عشق کا راز زمانے پر ظاہر نہیں ہوا تھا بلکہ عاشق اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتا تھا لیکن اب کیفیت دوسری ہو چکی ہے اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپک رہے ہیں۔ یہ خون کے آنسو اب زمانے پر یہ ظاہر کردیں گے کہ وہ عشق میں ناکام ہوا ہے اسی وجہ سے آنسوؤں کے قطروں کو شاعر نے مخبر کہا ہے کہ یہ زمانے کو میرے دل کی خبر دے رہے ہیں۔ اسی بات کا عاشق کو افسوس ہے۔ جو راز کسی کو معلوم نہیں تھا ان آنسوؤں نے جو کہ اب بصورت خون نکلتے ہیں زمانے تک پہنچا دیا اور عاشق کی بدنامی کا سبب بن گئے جس کا افسوس جس کا رونا اسے زندگی بھر رونا پڑے گا۔

محبوب کے ناز و نخرے سے جو زخم دل پر لگتے تھے انہوں نے اب ناسور کی صورت اختیار کر لی ہے۔ آنکھوں سے جو آنسو خون کی شکل میں نکلتے ہیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دل میں ناسور ہو گیا ہے۔ چوں کہ ناسور اچھا نہیں ہوتا اور وہ بھی عشق کا ناسور تو اور بھی اچھا نہیں ہوسکتا کیوں کہ روز ایک نئے زخم اس میں لگتے چلے جاتے ہیں لہٰذا عاشق کو اب عمر بھر یہی خون کے آنسو رونا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

7. عزیزؔ کی مندرجہ بالا غزل کتنے اشعار پر مشتمل ہے؟

8. اردو شاعری میں شمع اور پروانہ کس کی علامت سمجھے جاتے ہیں؟

9. چوتھے شعر کا کلیدی لفظ کون سا ہے؟

9.6 عزیزؔ لکھنوی کی غزل (2)

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا!
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا!
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں
مرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا
کچھ پوچھو شب وعدہ مرے گھر کی رونق
اللہ اللہ وہ ساماں سے ساماں ہونا
اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور!
کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا
ان سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیزؔ
خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

9.6.1 مجموعی تاثر

یہ غزل بھی انہیں واردات کے مضمون پر مبنی ہے جنہیں ہم معاملاتِ حسن وعشق کی کیفیت کہتے ہیں۔ عزیزؔ کی شاعری کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ ان کے یہاں الفاظ کا استعمال بڑی خوبی سے ہوتا ہے۔ سیدھی سادی زبان میں بلند خیال اور تخیل آفرینی کے مضامین نہایت حسن سلیقہ سے ادا ہو جاتے ہیں۔ عزیزؔ کی شاعری پر سیر حاصل بحث کرنے

کا یہ موقع نہیں ورنہ ان کے شعری محاسن پر گفتگو ضرور کی جاتی۔ اس طرح غزل کی تعریف جیسا کہ ہم جانتے ہیں' محبوب سے باتیں کرنا' محبوب کی باتیں کرنا یا واقعات حسن و عشق کو نظم کرنا ہے۔ اس پر عزیز پوری طرح قادر ہیں اور اس دائرے سے باہر نہیں نکلتے۔ ان کے تخیل پر خارجی مضامین کا اثر شاذ نظر آتا ہے۔ یہ غزل بھی ٹھیک اسی طرح ہے کہ

مرے سامنے اک مجسم غزل ہے
غزل دیکھ کر میں غزل کہہ رہا ہوں

آیئے' اب ان کے اشعار پر غور کرتے ہیں۔

9.6.2 غزل کی تشریح

پہلا شعر: جب آدمی کسی نئی جگہ جاتا ہے تو چاروں طرف ایک حیرت کی نگاہ ڈالتا ہے۔ ''پہلے پہل داخل زنداں ہونا'' سے مراد پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سچ مچ جیل خانہ کی بات ہو رہی ہے اور شاعر وہیں کی بات کر رہا ہے لیکن بندہ کی رائے یہ ہے کہ اس شعر میں ایہام اور شاعر کی مراد اس قید خانے سے نہیں ہے جہاں آدمی جرم کرنے کے بعد لایا جاتا ہے بلکہ اس کی مراد انسان کے دنیا میں قدم رکھنے سے ہے جب کہ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں قدم رکھتا ہے اور قدم رکھتے ہی حیرت سے رونا شروع کر دیتا ہے۔ شاعر اسی داخلے کی بات کر رہا ہے۔

دوسرا شعر: اس دنیا میں دو حادثے بہت اہم گزرے ہیں۔ نمبر ایک میرا مرنا اور نمبر دو تری زلفوں کا پریشاں ہونا۔ یہاں اس بات کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ عاشق و معشوق کے درمیان کیا تعلق ہے۔ ایک اور بات جو خاص طور سے قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ ''میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا'' یعنی عاشق کو جیتے جی محبوب کی کرم فرمائی کا انتظار ہی رہا لیکن اسے اس کا قرب نصیب نہ ہو سکا۔ شاعر کہنا چاہتا ہے کہ یہ راز میرے مرنے کے بعد ظاہر ہوا کہ ان کو مجھ سے کافی لگاؤ تھا کیوں کہ مرنے کی خبر پر ان کی زلفیں پریشان ہوا تھیں۔ ورنہ انہیں تو صرف قتل کرنے کی عادت ہوتی ہے یہ پریشان ہونا کیا جانیں؟ لیکن افسوس کہ یہ راز میرے مرنے کے بعد ظاہر ہوا۔ ''مرنا'' اور ''زلفوں کا پریشان ہونا'' میں ایک خاص تعلق ہے جو دل کے رشتے کی وضاحت کر رہا ہے۔

تیسرا شعر: محبوب نے عاشق سے اس کے گھر آنے کا وعدہ کیا ہے اس کے اس وعدے پر کہ محبوب آنے والا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اردو غزل کا محبوب وعدہ وفا نہیں کرتا پھر بھی عاشق کی معصومیت اسے وعدہ پر یقین کرنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ اس کے آنے کی خوشی میں گھر کو کس طرح سجایا گیا اس کے بارے میں کچھ مت پوچھیے کیوں کہ وہ باتیں بیان سے باہر ہیں کہ کس طرح کی آرائش کی گئی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ایک سے ایک چیز لا کر گھر کو جنت بنایا گیا تھا۔ اس شعر میں ''سامان'' اور ''ساماں'' کا استعمال ہوا ہے۔ اس میں تجنیس ناقص وزائد ہے۔ یہ اس جگہ قائم ہوتی ہے جب دو لفظوں میں صرف ایک حرف کی کمی یا بیشی ہو جائے۔ ایسے لفظ کہیں بھی یعنی ابتدا، درمیان یا آخر کہیں بھی آسکتے ہیں۔ ملن کی رات یا شب وعدہ کو میرے گھر کی رونق! مت پوچھیے! اللہ اللہ کیا سامانوں سے سجایا گیا تھا۔

چوتھا شعر: اللہ اللہ حیرت کے ساتھ، اے شعلۂ طور تیرا یہ طریقہ کہ تم نے اپنے جلوے کو کس طرح چھپایا ہے؟ کہ ساری دنیا انگشت بدنداں ہے۔ اس شعر میں صنعت تضاد ہے۔ صنعت تضاد شعر میں اس وقت قائم ہوتی ہے جب دو الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہوں اور شعر میں آ جائیں۔ جیسے صبح اور شام، رات اور دن وغیرہ۔ اس شعر کی بندش اور تخیل آفرینی قابل داد ہے۔ اس شعر میں موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ باندھا گیا ہے کہ جب انہیں کوہِ طور پر جلوہ دکھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بلایا تھا۔ جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش اور پورا کوہِ طور جل کر خاک ہو گیا تھا۔ اس تاریخی واقعے پر یہ شعر نظم کیا گیا ہے۔ جب کسی شعر میں اس طرح کے تاریخی واقعے کی طرف اشارہ ہوتا ہے تو وہاں صنعت تلمیح ہوتی ہے۔ اللہ نے اس شان سے اپنا جلوہ دکھایا کہ موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے۔ شعلۂ طور استعارۂ خدا ہے۔ اس سے ایک طرح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر شکایت کر رہا ہے کہ واہ رے خدا تعالیٰ! جلوہ بھی دکھلا دیا اور کسی نے دیکھا بھی نہیں، واہ تیری کیا نشان خود نمائی ہے۔

پانچواں شعر: عاشق بالکل آخری وقت جب کہ اس کی سانسیں ٹوٹنے والی ہیں۔ اپنے محبوب سے وصیت کرتا ہے کہ میں تو جا رہا ہوں لوگ روئیں گے مگر میری جان تم پریشان مت ہونا۔ اس شعر میں عاشق کا صبر اس کی انتہا کو پہنچا ہوا ہے کہ زندگی بھر کی بے التفاتیوں کے باوجود وہ اپنے محبوب کو پریشان ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ دنیا روئے اس سے

اس کے اوپر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر تم پریشان مت ہونا ورنہ قبر میں اس کی پیٹھ نہیں لگے گی۔ شاید اسی وجہ سے وہ محبوب سے وصیت کر رہا ہے کہ میرے مرنے کے بعد پریشان مت ہونا مجھ سے تمہارا دکھ دیکھا نہ جائے گا۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

10. مطلع میں لفظ ''زنداں'' سے شاعر کی مراد کیا ہے؟

11. غزل کے چوتھے شعر میں کون سی صنعت پائی جاتی ہے؟

12. صنعت تضاد کسے کہتے ہیں؟

9.7 خلاصہ

ادب زندگی اور تہذیب کا عکاس ہوتا ہے۔ چونکہ ادیب یا شاعر کسی معاشرے کا فرد ہوتا ہے لہٰذا اس معاشرے کی تہذیبی و معاشرتی زندگی کی عکاسی اس کے فن پارے میں ہونا لازمی ہے۔ ادب و شعر کا مطالعہ قاری میں تہذیب و زبان سے لگاؤ پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زبان کی باریکیوں سے بھی واقفیت پیدا ہوتی ہے۔ عزیزؔ لکھنوی کا کلام بھی انہی شعری خصوصیات کا آئینہ ہے جو دبستان لکھنؤ کے حوالے سے ہمارے شعری سرمائے کا حصہ رہی ہیں۔

عزیزؔ لکھنوی جن کا نام محمد ہادی تھا 1882ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ اساتذہ کے دواوین کے مطالعے نے شعر گوئی کی طرف راغب کیا۔ صفیؔ لکھنوی سے اصلاح سخن لی اور جلد ہی صف اول کے شعرا میں شمار ہونے لگے۔ پہلا مجموعہ ''گل کدہ'' 1919ء میں شائع ہوا اور باقی تخلیقات یعنی ''انجم کدہ'' اور ''قصائد عزیز'' ان کی وفات (1935ء) کے بعد شائع ہوئیں۔ عزیزؔ کی شاعرانہ خصوصیات میں مضمون آفرینی و تمثیل آفرینی کے ساتھ ہی سہل ممتنع کے باوجود غضب کی معنویت پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کے استفہامیہ انداز بیان کی انہوں نے کامیاب تقلید کی ہے۔ شامل نصاب دونوں غزلوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے اور کلاسیکی غزل کی روایات کا سچا شعور ان میں پایا جاتا ہے۔ واردات حسن و عشق، کیفیات دل و جگر اور احوال فکر و نظر کا اظہار سادہ، سلیس اور رواں نیز پر تاثیر زبان و بیان کے ساتھ کیا گیا ہے۔

9.8 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. عزیؔز لکھنوی کی حیات پر مختصر اُروشنی ڈالیے۔
2. تخیل آفرینی پر بحث کرتے ہوئے اس کی مثالیں بھی عزیؔز کے کلام سے دیجیے۔
3. عزیؔز کے استاد کا نام تحریر کیجیے اور ان کی ابتدائی زندگی پر مختصر نوٹ لکھیے۔
4. ''شمع بجھ کر رہ گئی.....داغ دل پر رہ گیا' کی تشریح اپنے لفظوں میں کیجیے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے:

1. عزیؔز کے حالات زندگی پر ایک نوٹ سپرد قلم کیجیے۔
2. ''گل کدہ'' کی خوبیوں سے بحث کیجیے اور اس کی خصوصیات بھی بتائیے۔
3. سہل ممتنع کی تعریف بیان کیجیے اور اس کی مثالوں سے وضاحت بھی کیجیے۔

9.9 فرہنگ

شعور	عقل' دانائی' واقفیت' پہچان	شعرفہمی	شعر سمجھنے کی قوت
شعری محاسن	شعر کی خوبیاں	دواوین	دیوان کی جمع
وفور	بہتات' فراوانی' زیادتی' افراط' کثرت		
الہام	وحی' کسی بات کا خدا کی طرف سے دل میں ڈالا جانا		
موروثی	آبائی' پشتینی' باپ دادا سے ملنے والی چیز		
استفادہ	فائدہ حاصل کرنا' فائدے کی خواہش کرنا		
معتمد	بھروسا رکھنے والا' قابل اعتبار		

نشیب وفراز	اتار چڑھاؤ، زمانے کا نفع نقصان	میلان	رجحان، جھکاؤ، توجہ
شغف	کمال محبت، انتہائی رغبت	داغ	دھبہ، نشان، عیب
استفہام	سمجھنا، دریافت کرنا، پوچھنا، تفتیش کرنا	نشتر	نوکدار اوزار، استرا
ضعف	کمزوری، ناطاقتی		
چارہ ساز	کام بنانے والا، معالج، خدا تعالیٰ		

9.10 معاون کتابیں

1. گل کدہ : عزیزؔ لکھنوی، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ 1936ء
2. انجم کدہ : عزیزؔ لکھنوی، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ 1959ء
3. بیسویں صدی کے بعض لکھنوی ادیب اپنے تہذیبی پس منظر میں
   : مرزا جعفر حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1978ء
4. اردو ادب کی تاریخ : عظیم الحق جنیدی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ

9.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. عزیزؔ لکھنوی کا اصل نام مرزا محمد ہادی اور عزیزؔ تخلص ہے۔
2. عزیزؔ کے استاد کا نام صفی لکھنوی ہے۔
3. عزیزؔ کے پہلے شعری مجموعے کا نام ''گل کدہ'' ہے جو ان کی حیات ہی میں شائع ہوا تھا۔
4. وہ نگاہیں کیا کہوں کیوں کر رگ جاں ہوگئیں
   دل میں نشتر بن کے ڈوبیں اور پنہاں ہوگئیں
5. تخیل آفرینی اس وقت ہوتی ہے جب شاعر کا خیال کچھ اس طرح کے مضمون باندھے جو عموماً

لوگوں کے خیال سے ممتاز ہو۔ مثلاً

کسی نے نزع کی اس طرح گتھیاں سلجھائیں
سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا

6. سہل ممتنع اسے کہتے ہیں جب کہ شعر میں ایسے الفاظ استعمال ہوں جو مشکل نہ ہوں اور شعر کی عبارت نثری جملے سے قریب تر ہوتا کہ شعر کی نثر کرنا مشکل ہو جائے۔ جیسے

ہائے کیا چیز تھی جوانی بھی
اب تو دن رات یاد آتی ہے

7. غزل (1) 13 اشعار پر مشتمل ہے لیکن انتخاب میں صرف پانچ اشعار شامل ہیں۔

8. شمع اور پروانہ، عاشق و معشوق اور عشق و حسن کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

9. چوتھے شعر کا کلیدی لفظ ''رہ گیا'' ہے۔

10. لفظ ''زنداں'' سے شاعر کی مراد عالم ہستی یعنی دنیا ہے۔

11. چوتھے شعر میں صنعت تضاد پائی جاتی ہے۔

12. جب شعر میں دو الفاظ ایسے آئیں جو معانی میں ایک دوسرے کی ضد ہوں تو انہیں صنعت تضاد کہتے ہیں۔

بلاک نمبر-3

نظم

اکائی ۸۔علامہ اقبالؔ: سید کی لوحِ تربت

اکائی ۹۔حالؔی: بحیثیت نظم نگار

اکائی ۱۰۔نظیرؔ اکبرآبادی: ہنس نامہ

یہ بلاک اردو نظم سے متعلق ہے۔اس میں تین اکائیاں شامل ہیں۔جس میں تین اہم نظم گوشعرا اقبال، حالی اورنظیر اکبرآبادی کی خدمات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔پہلی اکائی میں اقبال کی حیات اور کارناموں پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔انھوں نے فلسفہ اور حکمت کو شاعری کی زبان عطا کی۔شعر و فلسفہ کا حسین امتزاج ہی اقبال کے کلام کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔انھوں نے نظمیں بھی غزل کے انداز میں کہی ہیں۔ان کی ایک نظم ''سید کی لوحِ تربت'' اوراس کا تجزیہ اس اکائی میں پیش کیا گیا ہے۔دوسری اکائی میں آپ مولانا حالؔی کی زندگی اوران کی نثر و نظم کے متعلق پڑھیں گے۔اردو نظم نگاری کو فروغ دینے میں حالؔی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔جدید نظم گوئی کے آغاز کا سہرا حالؔی کے سر جاتا ہے۔اس اکائی کے مطالعے کے بعد اردو ادب میں حالؔی کی خدمات کے بارے میں آپ بخوبی معلومات حاصل کرسکیں گے۔تیسری اکائی کے ذریعہ اردو کے پہلے عوامی شاعر نظیرؔ اکبرآبادی کی حیات اوران کی نظم گوئی پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ آپ ان کی شخصیت اور ادبی خدمات سے متعارف ہوسکیں۔ان کی ایک شہرۂ آفاق نظم 'ہنس نامہ' کے اصل متن کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ساتھ ہی اس نظم کی تفہیم، تجزیہ اور خصوصیات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

اکائی 8 : علامہ اقبال: سید کی لوح تربت

ساخت

5.1 اغراض ومقاصد

5.2 تمہید

5.3 اقبال: حیات

5.4 اقبال کی خصوصیاتِ شاعری

5.5 اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت''

5.6 نظم ''سید کی لوح تربت'' کا تجزیہ

5.7 خلاصہ

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

5.9 فرہنگ

5.10 معاون کتابیں

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

5.1 اغراض ومقاصد

اقبال اردو کے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ انھوں نے اردو شاعری میں نئی روح پھونکی۔ انھوں نے فلسفے اور حکمت کو شاعری کی زبان عطا کی۔ شعر وفلسفہ کا حسین امتزاج ہی کلام اقبال کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ اقبال کی شاعری کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نظمیں غزلوں کے انداز میں لکھیں۔ اور ان کی غزلوں میں نظم کا سا ربط وتسلسل پایا جاتا ہے۔ اس اکائی کا مقصد طلبہ کو اقبال کی شاعرانہ عظمت سے واقف کرانا ہے۔ ساتھ ہی اس اکائی میں اقبال کی ایک نظم ''سید کی لوحِ تربت'' کا تجزیہ بھی پیش کیا جارہا ہے۔

5.2 تمہید

اس اکائی میں اقبال کی حیات اور کارناموں پر مختصر مگر جامع روشنی ڈالی جائے گی۔ اور ان کی شاعری کی

خصوصیات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا۔ جس میں ان کی فکر اور فن کا ارتقاء بھی شامل ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اقبال کی شعری بصیرت سے آگہی حاصل کر سکیں گے۔ آپ کے مطالعے کے لیے اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت'' کا تجزیہ سادہ اور آسان زبان میں کیا گیا ہے۔ اور اکائی کا خلاصہ بھی دیا گیا ہے۔ اس اکائی کے مطالعے سے آپ اقبال کی زندگی اور فن سے متعلق معلومات حاصل کریں گے۔

5.3 اقبال: حیات

اقبال اردو کے عظیم المرتبت شاعر ہیں۔ اقبال کا پورا نام شیخ محمد اقبال اور اقبال تخلص تھا۔ علامہ اقبال ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ خاندان برہمن تھا اور اٹھارویں صدی کے آغاز میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ اس خاندان کا قیام سری نگر میں تھا۔ اپنی نیکی، شرافت اور پاکبازی کے سبب یہ خاندان معزز اور ممتاز تھا۔ اس خاندان نے اٹھارویں صدی کے آخر میں ہجرت کی اور سیالکوٹ میں مقیم ہو گئے۔ علامہ اقبال کے دادا کا نام شیخ محمد رفیق تھا۔ اور والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اور امام بی بی ان کی والدہ تھیں۔ شیخ نور محمد کو دو بیٹے پیدا ہوئے ایک شیخ عطا محمد۔ اور دوسرے علامہ اقبال جو 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ اقبال کی تاریخ ولادت میں قدر اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن تقویم، ہجری و عیسوی کے حساب سے بعد کے محققین نے 9 نومبر 1877ء کو درست قرار دیا۔

اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ پانچ برس کی عمر میں ایک مکتب میں داخل کرایا گیا۔ یہ مکتب شوالہ والی اور مسجد میر حسام الدین محلہ کشمیریاں میں واقع تھا۔ انھوں نے مکتب میں قرآن مجید ناظرہ اور فارسی کی مروج تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد میر حسن کی خواہش پر ان کے مکتب واقع کوچہ میر حسام الدین میں اردو عربی اور فارسی کی تعلیم اور قرآن مجید کا درس حاصل کیا۔ اقبال کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے میں میر حسن نے بہت اہم رول ادا کیا۔

1893ء میں اقبال نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ سے انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ عربی ان کا اختیاری مضمون تھا یہ امتحان گجرات کے سنٹر سے دیا گیا۔ اسی سال وہ رشتہ ازدواج میں بندھ گئے۔ یہ ان کی پہلی شادی تھی کریم بی بی خان بہادر عطا محمد سول سرجن گجرات کی صاحبزادی تھیں۔ اس بیوی سے اقبال کے دو بچے ہیں۔ معراج بی بی اور آفتاب اقبال۔ اقبال نے اسکاچ مشن کالج سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اقبال نے آرٹس میں انگریزی (لازمی) کے علاوہ فلسفہ اور عربی کے مضامین اختیار کیے۔ 1895ء میں انھوں نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ وہ ایف۔ اے پاس کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے لاہور چلے آئے۔ لاہور کی

ادبی اور ثقافتی فضا نے اس ذہین نوجوان کی صلاحیتوں کو خوب نکھارا۔ آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ بی۔ اے انگریزی لازمی کے ساتھ فلسفہ عربی ان کے اختیاری مضامین تھے۔ 1897ء میں اقبال نے سکنڈ ڈویژن میں بی ۔اے کا امتحان پاس کیا اور دو تمغے حاصل کیے۔ اس دوران پروفیسر ٹامس آرنلڈ علی گڑھ کالج سے گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر بن کر آ گئے۔ اقبال کو پروفیسر آرنلڈ کی شاگردی کا موقع ملا۔ 1899ء میں اقبال نے ایم۔ اے فلفسہ کا امتحان دیا اور درجہ سوم میں کامیاب ہوئے۔ 13 مئی 1899ء کو ہی پنجاب یونیورسٹی میں بطور رمیکلوڈ عربک ریڈر ان کا تقرر عمل میں آیا۔ اور مئی 1903ء تک وہ یونیورسٹی اورینٹل کالج تحقیق و تصنیف، درس و تدریس اور عربی وار اردو مطبوعات کو منظم کرنے کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ ریسرچ اسکالری کے اس عرصہ میں اقبال تقریباً دو سال رخصت بلا تنخواہ لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی اسامی پر عارضی طور پر مقرر کر دیا گیا اور آپ یکم ستمبر 1905ء کو تین سال کی خصوصی رخصت لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے۔ اقبال نے کیمبرج سے فلسفہ اخلاق پر مقالہ لکھ کر بی۔ اے کیا۔ 1907ء میں میونخ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کی نشوونما وارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ یہ مقالہ انھوں نے پروفیسر میک ٹیگر یٹ کی رہنمائی میں تیار کیا۔ اور اس طرح 1908ء میں مڈل ٹمپل سے بیرسٹری کی بھی سند حاصل کی۔

22 اکتوبر 1908ء کو چیف کورٹ نے وکالت کے لیے اقبال کی درخواست منظور کی اور بطور وکیل چیف آف کورٹ انہوں نے لاہور میں پریکٹس شروع کر دی۔ یکم جنوری 1923ء میں اقبال کی علمی و ادبی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے حکومت نے انھیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا۔

اگرچہ علامہ شروع ہی سے ہندوستان کی سیاست میں دلچسپی لیتے رہے مگر 1926 کے بعد انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور اسی مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ اکتوبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنے مشوروں سے نمائندگی کا حق ادا کیا۔ لندن میں کانفرنس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے علاوہ مختلف انجمنوں کی تقریبات میں بھی شرکت کی۔ بعض اسلامی ملکوں کے اکابرین سے بھی ملاقاتیں کیں۔ لندن سے اٹلی، روم، وینس، مصر، اسکندریہ، قاہرہ، فلسطین ہوتے ہوئے واپس بمبئی آئے۔ انھوں نے 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ لندن سے پیرس، اسپین، میڈرڈ گئے۔ پیرس میں ان کی ملاقات فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ہوئی۔ پھر یہاں سے اقبال تین ہفتوں کے لیے اسپین کی سیاحت کے لیے روانہ ہو گئے۔ مسجد قرطبہ میں نفل پڑھی۔ ہسپانیہ میں قدیم اسلامی آثار اور خصوصاً مسجد قرطبہ کو دیکھ کر اقبال بے حد متاثر ہوئے۔ مسلمانوں کی

شان وشوکت کے آثار نے دل ودماغ پر ایک کیفیت طاری کردی۔ان کیفیات کا اظہار آپ نے اپنی شاعری میں کیا ۔1933ء میں وہ افغانستان گئے۔4دسمبر 1933ء کو پنجاب یونیورسٹی اور 1934ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اقبال کو ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگریاں تفویض کیں۔ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور یوں علالت کا سلسلہ شروع ہوا۔ آخر 21اپریل 1938ء کو اس مردقلندر نے اس جہانِ فانی کو خیر باد کہا اور اللہ کے ابدی دربار میں حاضر ہوگیا۔

اپنی مطالعے کی جانچ:

1. اقبال کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. اقبال کی ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟
3. اقبال نے کس موضوع پر پی۔ایچ ڈی کا مقالہ داخل کیا۔

5.4 اقبال کی خصوصیاتِ شاعری

اردو زبان وادب کی تاریخ میں اقبال کو ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔وہ بہ یک وقت ایک مفکر، بلند پایہ شاعر، دانشور، جید فلسفی، محبِ وطن، انسان دوست اور پیغامبر شاعر کی حیثیت سے بلند مرتبے کے مالک ہیں۔اقبال نے اردو شاعری میں نئی روح پھونکی۔اقبال کی شخصیت شعر وفلسفہ کا سنگم ہے۔تعقل وتفکر کے ساتھ ذوق جمال کی آمیزش نے اقبال کی شاعری کو بلندی کے ساتھ گہرائی بھی عطا کردی۔شعر وفلسفہ کا یہی حسین امتزاج کلامِ اقبال کی خصوصیت ہے۔اقبال نے فلسفیانہ افکار کو جس سلیقے اور فنکاری کے ساتھ شاعری کے حسین قالب میں ڈھالا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔یہ اقبال کی خوش ذوقی تھی کہ انھوں نے فلسفے کی خشکی کو رعنائی اور رنگینی عطا کردی۔

اقبال نے اردو شاعری کو نیا رنگ وآہنگ بخشا۔غزل میں حکمت وفلسفے اور متنوع موضوعات کو شامل کر کے اس کے دامن کو وسیع تر کردیا۔غزل کو حسن وعشق کے محدود دائرے سے نکالنے میں ان کا نام سرفہرست ہے۔انھوں نے غزل میں بھی اپنے فلسفیانہ افکار کا اظہار کیا ہے۔ان کی غزلوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں نظموں کا سا تسلسل پایا جاتا ہے اور نظموں میں غزل کا سا انداز ہوتا ہے۔اقبال کی شاعری میں نظم اور غزل کچھ ایسے قریب آجاتے ہیں کہ جس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ان کی نظموں میں کئی اشعار غزل کے رنگ وآہنگ میں ملتے ہیں۔ یعنی نظم کا اٹوٹ حصہ ہونے کے باوجود ان کو علاحدہ پڑھا جائے تو غزل کے شعر کی طرح ہر لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں۔

مثلاً:

اس موج کے ماتم میں روتی ہے حضور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

یہ شعر نظم کا حصہ ہونے باوجود خیال اور معنویت کے لحاظ سے اپنے آپ میں مکمل ہے۔ اقبال کے ایسے سینکڑوں اشعار ہیں۔ جنھیں لوگ دہراتے رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر اشعار ان کی نظموں کے ہی ہوتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کی ابتداء غزل سے ہوئی۔ وہ داغ کے شاگرد تھے۔ ابتداء میں اقبال نے داغ کے رنگ میں غزلیں کہیں۔ لیکن بہت جلد ان کا انفرادی رنگ پوری طرح ابھر آیا۔ چونکہ ان کا اپنا ایک مخصوص فلسفہ حیات تھا۔ وہ اپنے فلسفیانہ افکار کو شاعری کے ذریعہ عام کرنا چاہتے تھے۔

ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال نے زیادہ وطنی نظمیں کہی ہیں اور بعض نظموں میں انسان اور فطرت کا تقابل کرتے ہوئے انسان کی حقیقت کو جاننے اور انسانی زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش ملتی ہے۔ شروع میں انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ یہیں سے ان کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اقبال اردو کے پہلے شاعر ہیں جس کا ایک مستقل پیام اور مربوط فلسفہ حیات ہے۔ اسی لیے انھیں پیامبر شاعر بھی کہا جاتا ہے۔ اقبال کی شاعری کو بلندی عطا کرنے میں ان کا فلسفیانہ نقطہ نظر برابر کا شریک ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے کچھ اہم عناصر، خودی، عشق، عمل اور مرد مومن ہیں۔ انھوں نے انسان کی خودی کو اس کی زندگی کا مرکز قرار دیا ہے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیداری کائنات

اقبال نے خودی کے فلسفے کو اپنے فکر میں مرکزی نقطہ کی حیثیت دی ہے۔ خودی کے تصور کو سمجھنے کے بعد اقبال کی شاعری کی تفہیم آسان ہو جاتی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی ''اقبال کامل'' سے یہ اقتباس پیش ہے جو خودی کے تصور کو سمجھنے میں مدد کرے گا:

> ''خودی سے فخر غور مراد نہیں بلکہ اس سے وہ استقلال ذاتی مراد ہے جو ہر مخلوق کے علم و عمل کو ایک مخصوص دائرے میں نمایاں کرتا ہے۔ اس کی ذات وصفات کی بود و نمود کے مظاہر متعین کرتا ہے اور اس کی نشو ونما اور بالیدگی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ اس لیے وہ جوہر ہے عرق نہیں۔ آفتاب ہے آفتاب کا سایہ نہیں۔ متحرک ہے ساکن

نہیں۔غرض وہ ایک حقیقی زندگی ہے اور زندگی کی تمام لذتیں اس کے استحکام اس کی

توسیع اور اس کے اثبات سے وابستہ ہیں۔''

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خودی سے مراد خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین ہے۔ جب انسان کی خودی بلند ہوتی ہے تو اس کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ہے اور جب پست ہوتی ہے تو انسان زمین میں دھنس جاتا ہے۔اقبال اپنی قوم میں وہی ذوقِ یقین پیدا کرنا چاہتے ہیں جو زنجیروں کو بھی کاٹ دے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

خودی کو بیدار اور باعمل بنانے کے لیے ''عشق'' ضروری ہے۔اقبال نے عشق کا لفظ بھی عام معنوں میں استعمال نہیں کیا ہے۔ بلکہ مخصوص معنوں میں استعمال کیا۔اقبال کے یہاں عشق ایک جذبہ اور قوت عمل ہے۔فلسفہ خودی کی تشکیل کے دوران اقبال مولانا رومی کے تصور عشق سے بہت متاثر ہوئے ہیں یہی تصور ان کے فلسفہ کا اہم ترین حصہ ہے۔خودی کی سعی پیہم اور ارتقاء کے دوران جو چیز اسے آگے بڑھاتی ہے وہ یہی تصور ہے۔

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

اقبال عقل پر عشق کو فوقیت دیتے ہیں۔کیونکہ عقل تذبذب اور ہچکچاہٹ پیدا کرتی ہے۔ جب کہ عشق کسی بھی خطرہ کو خاطر میں نہیں لاتا اور بے دھڑک آگ میں کود پڑتا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اور جب عشق کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے تو انسان کبھی بھی بیکار اور بے عمل نہیں رہ سکتا۔حرکت و عمل کا پتلا بن جاتا ہے اور عمل سے ہی انسان اپنی زندگی کو جنت یا جہنم بناتا ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور جس میں یہ تمام جذبے ہوں وہ مردِ مومن ہے۔انسان کامرد مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبت ہے اور ان کے نظریہ خودی کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔اقبال مردِ مومن کی صفات اور اس کے

انفرادی ارتقا کی منازل ہی بیان نہیں کرتے بلکہ وہ اس معاشرے کی بھی پوری تصویر ہمارے سامنے کھینچ دیتے ہیں۔ جس میں مردمومن کی تربیت کے پورے سامان موجود ہوں ان کا یہ معاشرہ اسلامی تعلیمات پر مبنی ہے۔

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر ساز فطرت میں نوا کوئی
عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقۂ آفاق میں گرمیٔ محفل ہے وہ

اقبال کے خیالات' احساسات اور جذبات بالکل منفرد تھے۔ان خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے انھیں زبان کو بھی نئے انداز و مفہوم میں استعمال کرنا ضروری تھا۔ایک طرح سے انھوں نے اپنی زبان خود تخلیق کی۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک جو الفاظ اردو زبان میں خاص مفہوم کے تحت استعمال ہوئے تھے ان کو الگ اور مختلف مفہوم میں اُنہوں نے استعمال کیا جیسے خودی یا عشق' ان کے علاوہ انھوں نے شاہین اور مردمومن کے الفاظ بھی نئے مفہوم میں استعمال کیے جیسے شاہین ایک پرندہ ہے۔اس کی خاص صفات کے پیش نظر انھوں نے اس کو ایک علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔شاہین علامت ہے بلند پروازی کی۔استغنا کی' غیرت اور جرات کی۔ یہ پرندہ اپنا گھونسلا نہیں بناتا۔ پہاڑوں کی چٹانوں میں بسیرا کرتا ہے۔دوسروں کا شکار کیا ہوا نہیں کھاتا جب تک خود شکار نہیں کر لیتا۔اس کی ان ہی صفات کے پیش نظر اس لفظ کو عام اور معمولی مفہوم میں استعمال نہیں کیا بلکہ خاص طور پر غیر معمولی مفہوم میں استعمال کیا ہے۔اس لیے جب کبھی اور جہاں کہیں وہ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔یہ سارے مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں۔

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

کلام اقبال کے الفاظ نہایت شیریں اور سادہ ہوتے ہیں اور موقع اور صنف کے تقاضے کا بھی انھیں احساس رہتا ہے۔اس لیے ان کے کلام میں استعمال ہونے والے الفاظ سادہ اور سبک ہوتے ہیں۔محاورے اور ضرب الامثال بھی برجستہ ہوتے ہیں۔تراکیب میں زیادہ تر فارسی رنگ غالب رہتا ہے اور معانی کے تقاضے کے لحاظ سے

جدید اور خوش نما تراکیب وضع کرنے پر بھی اقبال کو قدرت حاصل ہے۔ منظر نگاری اور محاکات میں اقبال اپنے قلم سے وہی کام لیتے ہیں۔ جو ایک مصور اپنے قلم سے لیتا ہے۔

پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن

علامہ اقبال کی شاعری میں تخلیقی ارتقا کو سمجھنے کے لیے اسے تین ادوار میں بانٹا جاتا ہے۔ پہلا دور ابتدائے سے لے کر 1905 تک پر محیط ہے۔ اس دور کی نظمیں و غزلیں ان کے مجموعہ کلام ''بانگ درا'' میں ملتی ہیں۔ انھوں نے ابتدا میں روایتی انداز کی شاعری کی اور وطن کی عظمت کے ترانے گائے اور فطرت کے حسن کو بے نقاب کیا۔ اس دور کی شاعری میں ''وطنیت' کا پرچار ملتا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں مثلاً ترانہ ہندی' تصویر درد' نیا شوالہ' صدائے درد' ہندوستانی بچوں کا قومی گیت وطن پرستی کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

ایک حسن پرست کی طرح اس دور میں اقبال کا دوسرا واضح رجحان مناظر فطرت کی تصویر کشی تھا۔ ہمالہ' ابر کوہسار' ایک آرزو' ماہ نو' جگنو' ابر' کنار راوی وغیرہ ایسی ہی نظمیں اس دور کی حسین تخلیقات ہیں۔ مناظر فطرت سے اقبال کا یہ لگاؤ ان کی شاعری میں ہمیشہ باقی رہا۔ اس دور میں مناظر فطرت کو اقبال نے انسانی زندگی پس منظر میں بے حد اہمیت دی۔

چشمہ کوہسار میں' دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں' صحرا میں' ویرانے میں' آبادی میں حسن

روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس
ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور 1905ء تا 1908 تک کا ہے۔ یہ زمانہ آپ کے قیام یورپ اور حصول تعلیم کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں یورپ کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد اقبال میں اسلام سے وابستگی کا جذبہ قوی تر ہو گیا تھا۔ دنیا کے سیاسی اور مسلمانوں کے سماجی حالات دیکھ کر انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ صرف ہندوستان کے مسلمان ہی نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو بیداری اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔ اس دور کی نظموں میں براہ راست مسلمانوں کو مخاطب کیا۔ مثلاً 'علی گڑھ کے نام'۔ ''عبدالقادر کے نام''۔ 'صقلیہ وغیرہ ہیں۔ اس دوران انھوں نے یورپ کے فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس دور کی نظموں میں فلسفیانہ رنگ گہرا ہونے لگا۔ وطن پرستی کے محدود دائرے سے نکل کر وہ آفاقی مسائل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے اس دور کے سنگین مسائل کی طرف توجہ دی۔ جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

علامہ اقبال کی شاعری کا تیسرا دور 1908ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی شاعری کی بدولت انہیں دنیا کے لازوال شعرا کی صف میں جگہ ملی۔ علامہ اقبال کی شاعری کے تیسرے دور تک ملتِ اسلامیہ سیاسی' سماجی اور اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہو چکی تھی۔ تمام مسلمان ملک کی سامراجی طاقتوں کے غلام بن چکے تھے۔ مسلمانوں میں رنگ و نسل کے اختلاف پیدا ہو چکے تھے۔ آپس میں اتحاد ناپید تھا۔ بے عملی' ترک دین' قرآن سے دوری' مغرب پرستی اور باطل نظریات کو اپنانے کے سبب ان کی ملی وحدت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی تھی۔ غرۂ شوال' ہلال عید' شمع و شاعر' شکوہ' جواب شکوہ' خطاب بہ جوانان اسلام اور اس قبیل کی دوسری نظموں میں مسلمانوں کے زوال کے وجوہات بڑی صراحت سے بیان کیے ہیں۔ ان سب کے باوجود اقبال رجائیت کا دامن نہیں چھوڑتے انھیں یقین ہے کہ ایک دن۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اقبال کے اردو میں چار مجموعے 'بانگ درا' بال جبرئیل' ضرب کلیم اور ارمغانِ حجاز ہیں اور فارسی میں ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ اسرار خودی' رموز بے خودی' پیام مشرق' زبور عجم اور جاوید نامہ قابل ذکر ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

4. اس شعر کو مکمل کیجیے۔

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

5. ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال نے کس موضوع پر سب سے زیادہ نظمیں لکھیں؟

6. اقبال ابتداء میں اپنے کلام پر کس سے اصلاح لیتے تھے؟

5.5 اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت''

اے کہ تیرا مرغِ جاں تارِ نفس میں ہے اسیر — اے کہ تیری روح کا طائر قفس میں ہے اسیر
اس چمن کے نغمہ پیراؤں کی آزادی تو دیکھ — شہر جو اجڑا ہوا تھا اس کی آبادی تو دیکھ
فکر رہتی ہے مجھے جس کی وہ محفل ہے یہی — صبر و استقلال کی کھیتی کا حاصل ہے یہی

سنگِ تربت ہے مرا گرویدۂ تقریر دیکھ
چشمِ باطن سے ذرا اس لوح کی تحریر دیکھ

مدعا تیرا اگر دنیا میں ہے تعلیم دیں — ترکِ دنیا قوم کو اپنی نہ سکھلانا کہیں
وانہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زبان — چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے — دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پہ جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا — ہے دلیری دست ارباب سیاست کا عصا
عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے — نیک ہے نیت اگر تیری تو کیا پروا تجھے

بندۂ مومن کا دل بیم و ریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بے باک ہے

ہو اگر ہاتھوں میں تیرے خامۂ معجز رقم — شیشۂ دل ہو اگر تیرا مثالِ جامِ جم
پاک رکھ اپنی زباں تلمیذِ رحمانی ہے تو — ہو نہ جائے دیکھنا تیری صدا بے آبرو

سونے والوں کو جگا دے شعرِ اعجاز سے
خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

5.6 نظم ''سید کی لوحِ تربت'' کا تجزیہ

'سید کی لوحِ تربت' اقبال کی اہم اور مشہور نظم میں شمار کی جاتی ہے۔ اقبال کا ایک مستقل پیام اور مربوط فلسفۂ حیات ہے۔ اسی لیے انھیں پیامبر شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم وملت کو خواب غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ وہ مذہب میں جو بدعتیں پیدا ہوگئیں تھیں ان کی اصلاح کے لیے شاعری کو سب سے موثر اور مفید ذریعہ جانتے تھے۔ ان کا مقصد احیائے قوم تھا۔ انھوں نے شعر وادب کی قوت وتاثیر کو انسانی زندگی کے ارتقاء اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے ہم آہنگ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ سرسید احمد خاں اور اقبال میں یہ بات قدرے مشترک تھی کہ دونوں ہی اپنی قوم کے لیے سچی ہمدردی رکھتے تھے اور قوم کو اس پستی اور زبوں حالی سے نکال کر ترقی کی منزلوں پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے ۔دونوں نے تقدیر کے بجائے تدبیر پر زور دیا۔ جہاں سرسید نے اپنے مضامین میں یہ کہا کہ خدا بھی ان کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ وہیں اقبال نے کہا۔

تدبیر کی دستِ زیریں سے تقدیر درخشاں ہوتی ہے
قدرت بھی مہرباں ہوتی ہے جب کوششِ انساں ہوتی ہے

اقبال کی شاعری میں تقدیر کا فلسفہ یا تصور بہت جدید، مثبت، حیات بخش، روح پرور، ہمت افزا اور ولولہ انگیز ہے۔ جو پژمردہ شکستہ مایوس ذہن ودل میں امید، حوصلہ، عزم اور جوش پیدا کرتا ہے۔ تقدیر کے متعلق اشعار اس قدر زور، جوش، یقین کی گہرائی اور مثبت نظریہ سے پر ہیں کہ قارئین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتے۔ خالق کائنات تقدیر ساز ہے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنے آپ کو نہیں بدلتی۔ اقبال کی شاعری کی بنیاد اسلامی ہے اور اس میں زور انسانی قدروں، انسانی امکانات اور انسان کی مضمر لامحدود طاقتوں پر ہے۔

اپنی قوم تک اصلاحی پیام پہنچانے کے لیے اقبال نے سرسید جیسے مصلحِ قوم کا سہارا لیا۔ اقبال سرسید کی خدمت کا اعتراف کرتے ہیں۔ سرسید اپنی ذات میں انجمن تھے اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک بھی، عظیم مصلح، غیر معمولی بصیرت کے ماہر تعلیم، روشن خیال مذہبی مفکر، سیاسی مدبر، بے باک صحافی، غیر جانبدار مورخ اور منفرد طرز تحریر کے ادیب و انشا پرداز کی حیثیت سے سرسید تاریخ ہند کا ایک روشن باب ہیں۔ ایک طرف انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے مسئلہ کو موضوع بنایا تو دوسری طرف مسلمانوں کی اخلاقی، سماجی اور سیاسی بدحالی دور کرنے، انھیں پستی سے نکالنے کا زبردست کام کیا۔

سرسید کا یہ ماننا تھا کہ ہمارے زوال کا اہم سبب یہ ہے کہ ہم علوم وفنون سے دور ہوگئے ہیں۔ دنیا میں وہی

قومیں ترقی کرتی ہیں جو علوم وفنون میں مہارت رکھتی ہیں۔اس لیے انھوں نے سب سے پہلے تعلیم کی طرف توجہ کی اور مغربی علوم کو سیکھنے پر زور دیا۔ کیونکہ ان ہی علوم کے بل بوتے پر مغربی ممالک ساری دنیا پر چھا گئے تھے۔سرسید کی تعلیمی تحریک کی شدید مخالفت ہوئی لیکن وہ باوجود مخالف حالات کے اپنے کام میں لگے رہے۔اور اقبال سرسید کے ان نظریات سے متاثر نظر آتے ہیں۔سرسید نے اپنے دور کے حالات کے مطابق جو پالیسی اپنائی۔اقبال نے نہ صرف اس پالیسی سے اتفاق کیا بلکہ اس پالیسی کے بارے میں انھوں نے سرسید کو ان الفاظ میں خراج تحسین بھی پیش کیا:

''میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرسید کے خیالات اور ان خیالات کے ماتحت انھوں نے جو اقدامات کیے وہ تنقید سے بالاتر نہیں' ان میں گفتگو کی گنجائش ہے۔لیکن یہ اقدامات ضروری تھے' حالات کا تقاضا تھا کہ ایسا کوئی اقدام کیا جاتا جس سے مسلمانوں کی توجہ وقت کے تقاضوں اور مستقبل کی طرف منعطف ہوتی۔سرسید احمد کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے یہ اقدام کیا۔یہ اقدام بہر حال ضروری تھا۔یہی بات ہے جو ان کے نکتہ چینوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

اقبال اور سرسید میں جو قدر مشترک تھی وہ یہ کہ دونوں نے اپنی اپنی فکر سے مسلمان قوم کو جدید حالات کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار کیا۔اس سلسلہ میں سرسید نے تعلیمی' مذہبی' سیاسی اور ادبی اصلاح کو اہمیت دی۔ سرسید کے خیالات نے جب اقبال کے لیے راہ ہموار کی تو انھوں نے آگے بڑھ کر نہ صرف برصغیر بلکہ عالم اسلام کے مسلمانوں کو موضوع بحث بنایا اور ان تک اپنا پیغام پہنچایا۔

اس نظم میں اقبال نے اپنے خیالات وافکار کو سرسید جیسے مصلح قوم کی لوحِ تربت کی زبان ادا کر کے اس میں اور بھی زیادہ تاثیر پیدا کی ہے۔یہ نظم تجسیم کی بھی ایک بہترین مثال ہے کہ شاعر نے ایک بے جان تربت کو زبان عطا کر کے اسے جاندار بنا دیا ہے۔

پہلے بند میں لوحِ تربت (مزار کا پتھر جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے) وہ سرسید کی قبر پر زیارت کے لیے آئے زائر سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میری لوحِ تحریر کو پڑھنے کے لیے صرف بصارت نہیں بلکہ بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔آج کے حالات میں اگر سرسید اپنی قوم کے علماء سیاسی قائدین اور شعراء سے کچھ کہنا چاہتے تو وہ یہی باتیں ہوتیں۔جنھیں نظم کے اگلے بندوں میں پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے بند میں شاعر نے دین کے ساتھ ساتھ دنیا کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے۔ترک دنیا مذہب اسلام کی تعلیمات میں شامل نہیں ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں کہ اگر تم عالم دین ہو اور مذہبی تعلیمات کی اشاعت کرنا چاہتے ہو تو

مذہب کی حقیقی تعلیمات ہی عوام تک پہنچانا' مذہب کے نام پر ترک دنیا کرنے کی طرف انھیں ہرگز مائل نہ کرنا کہ رہبانیت اسلام میں ممنوع ہے۔ یہاں اقبال اپنے فلسفیانہ خیالات کو سرسید کی لوح تربت کی زبانی بیان کر رہے ہیں۔ ایک اور اہم موضوع فرقہ بندی ہے۔ اسلام میں جس سے بچنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ یہاں شاعر فرقہ بندی اور نااتفاقی کے سبب دنیا میں ہونے والے فسادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں ہر طرح کے تعصب اور گروہ بندی سے بچنا چاہیے۔ مذہبی رہنما یا خطیب کے کلام میں وہ اثر ہونا چاہیے جو دلوں کے توڑنے کے بجائے انھیں جوڑ کر آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کرے۔ اور یہ پیام محبت پہنچانے کے لیے زبان کا شیریں اور طرز ادا کا شگفتہ ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دوسروں کی دل شکنی ہو سکتی ہے۔ عفو درگزر کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شاعر مزید کہتا ہے کہ پرانی گزری ہوئی باتوں کو چھیڑنا' زخموں کو کریدنے کے برابر ہے۔ جس سے راحت کے بجائے تکلیفیں ہی اٹھانی پڑتی ہیں۔ بے حد مدبرانہ انداز میں شاعر نے یہاں علماء کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ فرقہ بندی سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ یہ نفرت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں لاتی۔

نظم کے تیسرے بند میں لوحِ تربت سیاسی قائدین سے مخاطب ہے۔ وہ کہتی ہے کہ تو اگر ایک مدبر ہے۔ سیاست سے وابستہ ہے اور عوام کی خدمت کا سچا جذبہ رکھتا ہے اور تجھے اپنی نیک نیتی پر پورا بھروسہ ہے تو کسی سے ڈرے بغیر بے خوف ہو کر اپنا کام کرنا چاہیے۔ اور ایک مومن کی پہچان بھی یہی ہوتی ہے کہ وہ حق بات کے لیے کسی سے ڈرتا نہیں بھلے ہی اس کے مدمقابل بادشاہِ وقت ہی کیوں نہ ہو۔

چوتھے بند میں اقبال نے سرسید کی زندگی اور اصلاحی کارناموں سے جو اثر قبول کیا' اس کو سرسید کی لوح تربت کی زبان سے ناصحانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس بند میں لوحِ تربت کا روئے سخن شاعر و ادیب کی طرف ہے۔ لوح تربت کہتی ہے تم اگر شاعر و ادیب بے نظیر تحریر لکھنے پر قادر ہو۔ اور انسانی زندگی کا ایسا عمیق مشاہدہ رکھتے ہو جیسے کہ جام جم۔ اس شعر میں اقبال نے جام جم کو تلمیح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تلمیح شاعری کی ایک صنعت ہے۔ جس میں شاعر کسی واقعہ کی طرف ہلکا سا اشارہ کرتا ہے اور وہ واقعہ قاری کے ذہن میں تازہ ہو جاتا ہے۔ ایران کے بادشاہ جمشید کے پاس ایک ایسا جام (پیالہ) تھا۔ جس میں وہ ساری دنیا کے حالات و واقعات دیکھ سکتا تھا۔ یہاں اقبال شاعر کے دل کو جام جم کہہ رہے ہیں اور مزید کہتے ہیں کہ شاعر کو اپنی زبان کو بدگوئی اور خوشامد سے پاک رکھنا چاہیے۔ کیونکہ شاعر ''تلمیذ رحمانی'' یعنی خدا کا شاگرد ہوتا ہے۔ کیونکہ شاعری خاص عطیہ الٰہی ہے جو سب کو نصیب نہیں ہوتی۔ اس لیے شاعر کو اپنے کلام کو بے وقعت ہونے بچا لینا چاہیے۔ آخر میں کہتے ہیں کہ شاعری کا مقصد انسانوں کی بھلائی اور گمراہوں کے لیے

بیداری ہونا چاہیے اور ایک شاعر کی آواز میں اتنا دم ہوتا ہے کہ وہ اپنی آواز کے شعلوں سے باطل کو جلا کر خاک بنا سکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ:

7. نظم ''سید کی لوحِ تربت'' اقبال کے کس مجموعے کلام میں شامل ہے؟
8. اس نظم میں اقبال نے کس کس کو مخاطب کیا ہے؟
9. اس شعر کو مکمل کیجیے۔

سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے

5.7 خلاصہ

شاعر مشرق علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد ان کے والد کا نام تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم مکتب شوالہ والی اور مسجد میر حسام الدین میں ہوئی۔ 1893ء میں انھوں نے اسکاچ مشن ہائی اسکول سیالکوٹ یس انٹرنس کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس سال ان کی شادی سول سرجن خان بہادر عطا محمد کی بیٹی کریم بی بی سے ہوئی۔ اسکاچ مشن کالج سے ایف۔اے کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے وہ لاہور چلے آئے۔ لاہور کی ادبی اور ثقافتی فضا نے ان کی صلاحیتوں کو خوب نکھارا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی انھوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ 1897ء میں انھوں نے بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔ اور 1899ء میں فلسفہ سے ایم اے کیا۔ پھر درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔ ستمبر 1905 کو تین سال کی رخصت خاص لے کر اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے انگلستان چلے گئے۔

1907ء میں میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کی نشوونما و ارتقا'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھا۔ اور 1908ء میں مڈل ٹمپل سے بیرسٹری کی بھی ڈگری حاصل کی۔ ہندوستان لوٹ کر وکالت شروع کر دی یکم جنوری 1923ء کو حکومت کی جانب سے انھیں 'سر' کے خطاب سے نوازا گیا۔

1926ء میں مجلس قانون ساز کے ممبر منتخب ہوئے۔ 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ دنیا کے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ 1932ء میں تیسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوے۔ اسی سفر کے دوران انھوں نے ہسپانیہ کا بھی دورہ کیا اور وہاں مسجد قرطبہ میں نفل نماز ادا کی۔ اور مسلمانوں کی شاندار ماضی سے اس قدر متاثر

ہوئے کہ شاہکار نظم ''مسجد قرطبہ'' تخلیق کی۔ اور 1933ء میں وہ افغانستان بھی گئے۔ 6 دسمبر 1933ء کو پنجاب یونیورسٹی اور دسمبر 1934ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اقبال کی ڈی۔لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی۔ صحت خراب رہنے لگی اور آخر 21 اپریل 1938ء کو ان کا انتقال ہوا۔

اقبال بلند پایہ شاعر کے ساتھ ساتھ ایک مفکر اور فلسفی بھی تھے۔ انھوں نے فکر و فلسفہ کو شاعری کے حسین قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ فکر و فلسفہ کا یہی حسین امتزاج کلام اقبال کی خصوصیت ہے۔ دوسری خصوصیت یہ کہ انھوں نے غزل اور نظم کی سرحدوں کو مٹا دیا۔ انھوں نے نظموں میں غزل کا سا انداز اپنایا اور ان کی غزلوں میں نظم کا سا ربط و تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان کی نظموں میں کئی اشعار غزل کے رنگ و آہنگ میں ملتے ہیں۔ یعنی نظم کا اٹوٹ حصہ ہونے کے باوجود ان کو علاحدہ پڑھا جائے تو غزل کے شعر کی طرح ہر لحاظ سے مکمل ہوتے ہیں:

اس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی

اس کے علاوہ اقبال کی شاعری کے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے انھیں تین ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ ہر دور کی اپنی نمایاں خصوصیات ہیں۔ ابتدائی دور میں ان کا رجحان 'وطنیت' اور فطرت کی طرف تھا۔ دوسرے دور میں فلسفیانہ افکار دکھائی دیتے ہیں۔ اور تیسرے دور میں انھوں نے اپنا روئے سخن ملتِ اسلامیہ کی طرف موڑ دیا۔

اقبال کی شاعری کو بلندی عطا کرنے میں ان کے فلسفیانہ نقطہ نظر نے بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ اقبال کی شاعری اور فلسفے کے کچھ اہم عناصر خودی، عشق، عمل اور مردِ مومن ہیں۔ انھوں نے خودی کے فلسفہ کو اپنے فکر میں مرکزی نقطہ کی حیثیت دی ہے۔ ان کے یہاں خودی سے مراد خود پرستی یا خود پسندی نہیں بلکہ اپنی ذات پر بھروسہ اور یقین ہے اور خودی کو بیدار اور باعمل جانے کے لیے ''عشق'' کو ضروری عنصر تصور کرتے ہیں۔ عشق اقبال کے یہاں عام معنوں میں نہیں بلکہ خاص معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اقبال عقل پر عشق کو فوقیت دیتے ہیں کیونکہ عقل تذبذب پیدا کرتی ہے اور عشق کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔

اقبال تدبیر اور عمل پر بہت زور دیتے ہیں۔ انسان اپنی تدبیر اپنے عمل سے ہی اپنے لیے جنت یا جہنم کا حقدار ہوتا ہے۔ اقبال کے فلسفے میں مردِ مومن کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ اور یہی مردِ مومن ان کے نظریۂ خودی کے ارتقا کی آخری کڑی ہے۔

اقبال نے لفظ شاہین کو بھی ایک نئی معنویت عطا کی ہے۔ اس کی صفات کے پیش نظر انھوں نے اس کو ایک

علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ شاہین علامت ہے بلند پروازی کی۔ استغنا کی، غیرت اور جرات کی۔ جب کبھی اور جہاں کہیں وہ اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ سارے مفاہیم ظاہر ہوتے ہیں۔

اقبال کی نظم ''سید کی لوحِ تربت' کا تجزیہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنی قوم کی اصلاح کے لیے اس نظم میں مختلف خیالات پیش کیے ہیں اور یہ تمام خیالات لوحِ تربت (مزار کا پتھر، جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے) کی زبانی ادا کیے ہیں۔ یہ نظم تجسیم کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس میں شاعر نے ایک بے جان پتھر کو جاندار بنا کر پیش کیا ہے۔ لوحِ تربت یہ کہتی ہے کہ مجھ کو پڑھنے کے لیے صرف بصارت نہیں بلکہ بصیرت کی بھی ضرورت ہے۔ اس نظم میں اقبال نے علمائے دین، مدبرین اور شعراء کو مخاطب کیا ہے۔ اور باری باری ان کو حق کا ساتھ دینے اور دنیا میں امن وامان بنائے رکھنے کی ہدایت دی ہے۔

5.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے؟

1. اقبال کے حالاتِ زندگی کا مختصر جائزہ لیجیے۔
2. اقبال کے تصورِ خودی کو مثالوں سے واضح کیجیے۔
3. اقبال کی شاعری میں 'شاہین' پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

(ب) مندرجہ ذیل سوالات کے جواب 30-30 سطروں میں دیجیے؟

1. اقبال کی شاعرانہ خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیجیے؟
2. اقبال کے فلسفیانہ افکار پر روشنی ڈالیے۔
3. نظم 'سید کی لوحِ تربت' کا خلاصہ اپنی زبان میں بیان کیجیے۔

5.9 فرہنگ

اسیر	قیدی، بندی
طائر	پرندہ
قفس	پنجرہ
بیم وریا	خوف اور دکھاوا

تلمیذ رحمانی	خدا کا شاگرد، مجاز اشاعر
اعجاز	معجزہ کرامت
باطل	غلط۔ناحق
مدبر	تدبیر کرنے والا۔عاقل۔مشیر
گرویدۂ تقریر	تقریر کی طرف مائل
استغنا	بے نیازی
تعقل	سمجھنا، سوچنا، غور کرنا
تفکر	فکر، سوچ، بچار
لوح	مزار کا پتھر جس پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہوتی ہے
جامِ جم	ایران کے بادشاہ جمشید کا پیالہ جس میں وہ دنیا کے تمام حالات کا عکس دیکھ لیتا تھا۔ اسے جام جمشید کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔

5.10 معاون کتابیں

1. فکر اقبال از: خلیفہ عبدالحکیم
2. روحِ اقبال از: ڈاکٹر یوسف حسین خاں
3. ذکر اقبال از: مولانا عبدالمجید سالک
4. اقبال کا فن از گوپی چند نارنگ

5.11 اپنے مطالعے کی جانچ: جوابات

1. اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔
2. اقبال کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ کے ایک مکتب میں ہوئی۔
3. اقبال نے ''ایران میں مابعد الطبیعیات کی نشو ونما اور ارتقاء'' پر پی۔ایچ ڈی کا مقالہ داخل کیا۔
4. اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی

ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد

5. ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال نے سب سے زیادہ 'وطنیت' کے موضوع پر نظمیں لکھیں۔

6. اقبال ابتدا میں اپنے کلام پر اصلاح داغؔ سے لیا کرتے تھے۔

7. نظم 'سید کی لوحِ تربت' بانگ درا میں شامل ہے۔

8. اس نظم میں اقبال نے علماء سیاسی قائدین اور شعراء کو مخاطب کیا ہے۔

9. سونے والوں کو جگا دے شعر کے اعجاز سے

خرمنِ باطل جلا دے شعلۂ آواز سے

اکائی 09 : الطاف حسین حالی۔ بحیثیت نظم نگار

ساخت

6.1 اغراض ومقاصد

6.2 تمہید

6.3 سوانحی حالات

6.4 حالی کی نثر نگاری

6.5 حالی کی غزل گوئی

6.6 حالی کی نظم نگاری

6.7 خلاصہ

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

6.9 فرہنگ

6.10 سفارش کردہ کتب

6.11 اپنی معلومات کی جانچ: جوابات

6.1 اغراض ومقاصد

انسان ماضی کے حالات وواقعات سے بہت کچھ سیکھتا ہے اور اسے اپنی زندگی میں داخل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے ٹھیک اسی طرح اردو ادب میں ایسے واقعات وحالات کی منظر کشی ملتی ہے جس سے انسان بہت کچھ سیکھتا ہے ادب زندگی کے مقاصد اور زندگی کی خوبصورت جہات پیش کرتا ہے جس میں مختلف عوامل وعناصر زندگانی پوشیدہ ہوتے ہیں۔ ہم مختلف ادبا وشعراء کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں ان کی خدمات وتخلیقات کا مطالعہ کرتے ہیں اور ان کی خوبیوں کو اخذ کرتے ہیں اور اپنی زندگی کا حصہ بناتے ہیں۔ انھیں اردو شعرا کی صف میں خواجہ الطاف حسین حالی کا شمار ہوتا ہے جنھوں نے اردو ادب میں ایک خاص جہت اور الگ شناخت قائم کی۔ اردو ادب میں تنقید نگاری کی باضابطہ بنیاد گزاری انھیں کے سعی پیہم کا نتیجہ ہے۔ آپ اس اکائی میں حالی کی زندگی اور ان کی نثر ونظم سے متعلق پڑھیں گے۔

ہمیں اُمید ہے کہ آپ اس اکائی کے مطالعے کے بعد اردو ادب میں حالی کی خدمات کے بارے میں بخوبی معلومات حاصل کرسکیں گے۔

6.2 تمہید

الطاف حسین حالی اردو ادب کے ایک اہم ستون ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام تر زندگی اردو شعر و ادب کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی۔ وہ ایک بہترین نثر نگار، منفرد لب ولہجہ کے شاعر اردو کے پہلے نقاد اور سوانح نگار تھے۔ اردو نظم نگاری کو فروغ دینے میں حالی کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ حالی نے مثنوی، مرثیہ اور غزل میں طبع آزمائی کی لیکن اردو میں جدید نظم گوئی کا آغاز حالی کی شاعری سے ہوتا ہے۔ اس اکائی میں حالی کے سوانحی حالات، نثر نگاری، غزل گوئی اور نظم نگاری کے بارے میں آپ معلومات فراہم کریں گے۔

6.3 سوانحی حالات

سلطان غیاث الدین بلبن کے زمانے میں ملک ہرات سے ایک عالم خواجہ ملک علی ہندوستان آئے۔ بادشاہ خود ذی علم اور عالموں کا قدر دان تھا اس نے خواجہ ملک علی کے علم و فضل سے متاثر ہوکر انہیں پانی پت میں جاگیر عطا کی۔ یہاں انہوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ ان کی پندرھویں نسل میں خواجہ ایزد بخش نام کے ایک بزرگ گذرے ہیں۔ انہیں 1837ء (1253ھ) میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام خواجہ الطاف حسین رکھا گیا۔ اسی الطاف حسین نے حالؔی کے نام (تخلص) سے سارے ہندوستان میں شہرت پائی۔

حالؔی کی تعلیم پانچ سال کی عمر سے شروع ہوئی انہوں نے عربی، فارسی اور مذہبی کتابیں پڑھیں اس وقت کے دستور کے مطابق انہوں نے قرآن حفظ کیا۔ حالی ابھی نو سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی خواجہ امداد حسین نے ان کی پرورش کی۔ مالی حالات نے خواجہ الطاف حسین کو باقاعدہ اسکول کی تعلیم سے محروم رکھا مگر وہ تحصیل علم کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی شادی ان کی ماموں زاد بہن اسلام النساء سے ہوئی۔ اس کے باوجود علم حاصل کرنے کی جستجو اور بڑھ گئی۔ دہلی جاکر علم حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا ایک دن چپکے سے رات کے وقت گھر سے نکلے اور دہلی کی طرف چل پڑے۔ پانی پت سے دہلی (55) میل کا فاصلہ انہوں نے پیدل طے کیا۔ 1854ء میں دہلی پہنچے تو اتنے بڑے شہر میں نہ کسی سے جان پہچان تھی اور نہ ہی ان کے پاس پیسہ تھا۔ یہاں آکر انہیں پتہ چلا کہ جامع مسجد کے قریب ایک مسجد میں ''حسین بخش کا مدرسہ'' ہے جہاں غریب لڑکوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ حالؔی اس مدرسہ

میں شریک ہو گئے اور مولوی نوازش علی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ یہیں مسجد کے فرش پر وہ سو رہتے جو ملتا وہ کھا لیتے۔ حالی نے نوازش علی کے علاوہ مولوی فیض حسن، مولوی امیر احمد اور مولوی سید نذیر حسین سے بھی علم حاصل کیا۔

دہلی میں اس وقت بڑے بڑے شاعر، ادیب اور عالم موجود تھے مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے۔ حالی مشاعروں میں جانے لگے اور خود انہیں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا۔ دہلی میں حالؔی کی ملاقات کئی بڑے شاعروں سے ہوئی۔ ان میں مرزا غالبؔ بھی تھے جن کا بڑا شہرہ تھا۔ حالؔی کو غالبؔ کا کلام بہت پسند آیا اور ان کے دل پر غالبؔ کی شخصیت کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ جو زندگی بھر رہا دہلی کے قیام کے زمانے میں حالؔی نے ''خستہ'' تخلص اختیار کیا تھا لیکن غالبؔ کے کہنے سے انہوں نے اپنا تخلص بدل کر حالؔی کر دیا۔ اسی نام سے وہ دنیا میں مشہور ہوئے۔ اسی زمانے میں حالؔی نے غالبؔ کو اپنی کچھ غزلیں دکھائیں۔ غالبؔ بہت کم کسی کو شعر کہنے کا مشورہ دیتے تھے مگر حالؔی کی غزلیں انہیں پسند آئیں اور انہوں نے کہا۔

''میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا مگر تمہاری نسبت میرا
خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر ظلم کرو گے۔''

غالبؔ نے سترہ اٹھارہ سال کے لڑکے میں چھپے شاعری کے جوہر کو پہچان لیا تھا۔ اس سے حالؔی کی ہمت بہت بڑھ گئی اور وہ دل لگا کر شعر کہنے لگے۔ ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور دوسرے علوم سے بھی سیراب ہو رہے تھے۔ 1855ء میں وہ اپنے گھر والوں کے اصرار پر دہلی چھوڑ کر پھر واپس پانی پت آ گئے۔ مگر یہاں بھی لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ 1856ء میں حالؔی خاندان کا بوجھ بٹانے شہر حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہو گئے۔ 1857ء میں غدر ہوا، لاکھوں مارے گئے، ہزاروں بے گھر ہو گئے۔ حصار میں بھی گڑبڑ مچی۔ جس کی وجہ سے حالی پھر دہلی آئے۔ غدر نے دہلی کو تباہ و برباد کر دیا تھا پھر بھی علم و ادب کا کچھ چرچا باقی تھا۔ حالی یہاں آئے تو پھر شعر و ادب کی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔

یہاں غالبؔ سے تو ان کی ملاقات تھی نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ سے بھی ملے جو جہانگیر آباد کے رئیس تھے۔ نواب مصطفیٰ خان صاحب ذوق شاعر بھی تھے وہ حالؔی کی شخصیت اور علم و ادب سے بڑے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے لڑکے کا اتالیق مقرر کر دیا انہیں اپنے ساتھ جہانگیر آباد لے گئے۔ حالؔی اور شیفتہؔ اکثر دہلی آتے جاتے رہتے اور غالبؔ سے ملتے رہتے تھے۔ شیفتہؔ کو بھی غالبؔ سے بڑی محبت اور عقیدت تھی۔ غالبؔ سے حالؔی کی محبت بڑھتی گئی۔ 1869ء میں حالی نے غالبؔ کی سوانح بھی لکھی۔

1869ء میں مصطفیٰ علی خان شیفتہ کا بھی انتقال ہوگیا۔شیفتہ کی وفات کے بعد حالی پھر فکر معاش میں مبتلا ہو گئے۔

اس زمانے میں حالی کے علم وفضل اور شاعری کی شہرت سارے ملک میں پھیل رہی تھی۔لوگ ان کی قدر کرنے لگے تھے۔پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو نے اپنے یہاں ان کو ملازمت کی پیشکش کی اور حالی دہلی سے لاہور چلے گئے۔یہاں ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ جو کتابیں اس بک ڈپو میں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوتی تھیں ان کی نظر ثانی کریں اور ان کی زبان درست کریں۔یہ کام حالی نے بڑی محنت سے انجام دیا۔یہاں انگریزی ادب،شاعری اور تنقید کے بہت سے ترجمے انہوں نے پڑھے جس کی وجہ سے ان کی زندگی میں ایک انقلاب آیا۔اب تک حالی روایتی شاعری کرتے تھے۔اگر چہ ان کے دل میں لگن تھی کہ وہ شاعری سے کوئی ایسا کام لیں جو ملک وقوم کے لیے فائدہ مند ہو۔محمد حسین آزاد بھی حالی کے ساتھ پنجاب بک ڈپو میں ملازم تھے۔ان کی بھی کوشش تھی کہ شاعری کا رنگ بدل دیں۔ انہوں نے لاہور میں نئے طرز کے مشاعرے شروع کیے جس میں غزل کے بجائے موضوعاتی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ حالی کو یہ جدت پسند آئی۔ان ہی مشاعروں کے لیے انہوں نے برکھارت،نشاط امید،مناظرہ رحم وانصاف اور حب وطن نظمیں لکھیں یہ ساری نظمیں بہت پسند کی گئیں۔کچھ عرصے بعد یہ مشاعرے بند ہو گئے مگر حالی کو نئے انداز کی شاعری کی جو لگن لگ چکی تھی وہ برقرار رہی۔انہوں نے کئی اور نظمیں لکھیں جن میں مناجات بیوہ (1884ء) اور مثنوی چپ کی داد (1905ء) بہت مشہور ہوئیں۔

اس عرصہ میں ہر جگہ ان کی شاعری کا چرچا ہونے لگا تھا۔لاہور میں حالی کی صحت گرنے لگی۔چار سال لاہور میں قیام کے بعد وہ پھر دہلی آئے اور اینگلو عربک اسکول میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔دہلی میں ان ملاقات سرسید سے ہوئی۔پہلی ہی بار وہ ان سے بہت متاثر ہوئے اور ان کے خلوص اور کام کی اہمیت کو سمجھ گئے اور دل وجان سے ان کے ساتھی بن گئے۔سرسید نے حالی سے خواہش کی کہ ترقی یافتہ ملکوں میں شاعری سے بڑے بڑے کام لیئے جاتے ہیں آپ بھی اپنی شاعری سے قوم کو جگانے اور انہیں سدھارنے کا کام لیجیے۔سرسید نے جو کہا تھا حالی نے ''مسدس حالی'' کے دیباچہ میں اسے یوں لکھا ہے:

> ''قوم کے ایک سچے خیر خواہ (سرسید) نے غیرت دلائی کہ حیوانِ ناطق ہونے کا دعوا کرنا اور خدا کی دی ہوئی زبان سے کچھ کام نہ لینا بڑے شرم کی بات ہے۔عزیز ذلیل ہو گئے۔شریف خاک میں مل گئے۔علم کا خاتمہ ہوگیا۔دین کا صرف نام باقی ہے۔افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ایسے میں جس سے جو کچھ بن آئے سو بہتر ہے۔نظم جو بالطبع مرغوب ہے اور خاص

کر عرب کا ترکہ اور مسلمانوں کا ورثہ ہے قوم کو بیدار کرنے کے لیے کسی نے نہیں لکھی۔''

سرسید کی باتوں کا حالی پر بہت اثر ہوا اسی کا نتیجہ ''مسدس حالی'' ہے جو ''مسدس مدوجزر اسلام'' کے نام سے 1879ء میں شائع ہوئی۔ اس مسدس نے مسلمانوں کو غیرت دلائی اور خواب غفلت سے بیدار کر کے نئی تعلیم اور نئی زندگی کی طرف متوجہ کر دیا۔

مسدس حالی جب پہلی بار شائع ہوئی تو ایک ہل چل مچ گئی۔ لوگ پڑھتے اور روتے تھے۔ لوگوں نے مسدس کی تعریف کی مگر سب سے زیادہ قدر سرسید نے کی۔ انہوں نے حالی کو لکھا۔

''اگر خدا مجھ سے پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا لایا اور کچھ نہیں۔''

سرسید کو فخر تھا کہ حالی نے ان کی خواہش پر ایک بے مثال نظم لکھی۔ اگرچہ اس کی مخالفت بھی ہوئی۔ مگر یہ مخالفتیں زیادہ دن نہ چل سکیں۔ رام بابو سکسینہ ''تاریخ ادب اردو'' میں مسدس کی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے۔

''وہ ایک ایسی کتاب ہے جو پیمبروں اور اوتاروں پر نازل ہوتی ہے وہ ایسا تارا ہے جو شاعری کے آسمان پر چمکا اور ہندوستان میں اس کی وجہ سے قومی اور وطنی نظموں کا لکھنا شروع ہوا۔''

مسدس حالی شاہکار نظم ہے جس نے اردو شاعری کے دھارے کو موڑ دیا اب تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں بہت سی ہندوستانی اور کئی غیر ملکی زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں۔

حالی نے بارہ برس اینگلو عربک اسکول میں ملازمت کی جب 1878ء میں سرسید کی سفارش پر حکومت حیدرآباد کے وزیر اعظم سر آسمان جاہ نے اپنے حکومت کی جانب سے حالی کو پچھتر روپیہ ماہانہ کا وظیفہ جاری کر دیا تو حالی نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی اور پانی پت جا کر علمی اور ادبی کاموں میں مشغول ہو گئے۔ 1891ء میں یہ وظیفہ سو روپیہ ماہانہ کر دیا گیا۔

پانی پت منتقل ہونے کے بعد حالی نے علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلے میں طویل سفر کیے 1891ء میں وہ سرسید کے ساتھ حیدرآباد بھی آئے تھے۔ یہاں بہت عزت اور احترام سے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ان کے اعزاز میں بڑے بڑے جلسے بھی ہوئے تھے۔ علی گڑھ کالج کے علمی ادبی جلسوں میں بھی حالی شریک ہوتے تھے۔ ان سب مصروفیتوں کے باوجود حالی اپنے ادبی کاموں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ یہیں پانی پت میں انہوں نے 1886ء میں فارسی کے مشہور شاعر شیخ سعدی شیرازی کی سوانح حیات سعدی' 1897ء میں اردو اور فارسی کے مشہور شاعر مرزا اسد اللہ خان غالب کی سوانح ''یادگار غالب'' اور 1901ء میں سرسید احمد خان کی ضخیم سوانح ''حیات جاوید'' لکھی۔ اس

طرح حالؔی نے اردو میں تین اعلیٰ پایہ کی سوانح عمریاں لکھ کر اردو زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ یہیں پانی پت میں حالؔی نے اردو تنقید کی پہلی بنیادی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' (1893ء) لکھی جو اردو تنقید میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہیں حالؔی نے بہت سے مضامین لکھے جو ''مقالات حالی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ''مکتوبات حالؔی'' اور ''مکاتیب حالؔی'' بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ 1890ء میں ''مجموعہ نظم حالؔی'' اور 1893ء میں دیوانِ حالی شائع ہوئے۔

حالؔی بڑی خوبیوں کے انسان تھے وہ بڑے عالم تھے، بڑے ادیب اور شاعر تھے۔ انہوں نے اردو نظم و نثر کو ایک نئی زندگی اور ایک نیا روپ دیا۔ سرسید کے ساتھ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے میں بڑا حصہ لیا۔ ساتھ ہی عورتوں کی تعلیم کو رواج دینے میں پہل کی۔ سماج کی اصلاح کے لیے بہت سے کام کیے۔ وہ سادگی اور شرافت کا مجسمہ تھے۔ سادگی ان کے شعر اور ادب کی بھی جان ہے اور ان کی شخصیت کا بھی جوہر ہے۔

1904ء میں حالؔی کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں حکومت ہند کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ اور دس سال بعد 31 ڈسمبر 1914ء کو انہوں نے اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی اور پانی پت میں مشہور صوفی درویش حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے احاطہ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

1. حالی کے والد کے انتقال کے وقت حالی کی کیا عمر تھی؟
2. حالی دہلی کے کس مدرسے میں شریک ہوئے۔
3. حالی کی مسدس مدوجزر اسلام کب منظر پر آئی؟

6.4 حالی کی نثر نگاری

حالؔی بیک وقت اعلیٰ درجے کے شاعر، بہترین انشا پرداز، غیر معمولی نقاد اور بے مثال سوانح نگار تھے۔ حالی کی سب سے پہلے نثری تصنیف جو اردو میں ملتی ہے وہ مجالس النساء ہے۔ یہ 1874 میں لکھی گئی۔ یہ تصنیف دو حصوں میں لکھی گئی ہے اور ناول کی ابتدائی شکل ہے۔ اس کا اسلوب آسان اور عام فہم ہے۔ عرصہ تک پنجاب اور یوپی کے نصاب میں شامل رہی۔ اس تصنیف پر حالی کو حکومت کی طرف سے چار سو روپے انعام بھی ملا تھا۔

حالی کی دوسری اہم تصنیف مقدمہ شعر و شاعری ہے۔ یہ مقدمہ دیوان حالی کے ساتھ 1893ء میں شائع ہوا

تھا۔ یہ تصنیف بھی دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں شعر کی تعریف اور اس کی خصوصیات بیان کیے گئے ہیں۔ اور دوسرے حصے میں اردو کی روایتی شاعری غزل، قصیدہ اور مثنوی کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ یعنی مقدمہ شعر و شاعری کا پہلا حصہ نظری اور دوسرا حصہ عملی مباحث پر مشتمل ہے۔

حالی ان اولین مصنفین میں سے ہیں جنہوں نے اردو نثر میں سوانح نگاری کو مقبولیت عطا کی۔ حیات سعدی یادگار غالب اور حیات جاوید اردو نثر میں سوانح نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ حالی کی سب سے پہلی سوانح ''حیات سعدی'' 1886ء اور دوسری ''یادگارِ غالب'' 1897ء اور تیسری ''حیات جاوید'' 1901ء میں شائع ہوئیں۔

''حیات سعدی'' نہ صرف حالی کی پہلی سوانح نگاری ہے بلکہ اردو کی بھی پہلی سوانح نگاری ہے اور اس اعتبار سے حالی اردو سوانح نگاری کے موجد ہیں۔ گو ''حیات سعدی'' مختصر لیکن جامع ہے۔ کافی تحقیقی کدو کاوش کے بعد جتنا بھی مواد مل سکا اکٹھا کر دیا۔ یہ اردو زبان و ادب کی پہلی کتاب ہے جس میں شیخ سعدی کے مفصل حالات ملتے ہیں۔

''یادگارِ غالبؔ'' حالی کی دوسری سوانح نگاری ہے۔ حالی کو غالبؔ سے دلی عقیدت اور محبت تھی۔ ان کی سیرت و شخصیت اور کلام کی خوبی اور عظمت کے دل سے قائل تھے۔ شاگرد ہونے کے ناطے محترم جانتے تھے۔ اور پھر دونوں میں مشفقانہ اور مخلصانہ تعلقات بھی تھے۔ اس طرح غالب مربی، دوست اور ہمعصر بھی تھے۔ چنانچہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی سوانح نگاری کے لیے غالب جیسا باکمال شاعر اور بلند پایہ شخصیت کے مالک کا انتخاب کیا۔ ''یادگارِ غالب'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول حیاتِ غالب اور حصہ دوم کلام سے متعلق ہے۔

''حیاتِ جاویدؔ'' یہ ضخیم ترین سوانح نگاری ہے جس میں سرسید احمد خاں کے حالاتِ زندگی، ان کی سیرت و شخصیت اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔

حیات جاوید دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں تاریخی ترتیب کے لحاظ سے زندگی کے حالات اور کارناموں کا بیان اور دوسرے میں کارناموں پر تبصرہ اور اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا گیا ہے۔ سرسید کے خاندانی حالات سے لے کر ان کی رحلت تک کے واقعات ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ حیات جاوید پر اکثر یہ اعتراضات کیے جاتے ہیں کہ حالی نے دعویٰ کیا تھا کہ حیات جاوید کی بنیاد نکتہ چینی پر رکھی جائے گی۔ مگر اس سلسلہ میں حالی ناکام رہے ہیں۔ اور انہوں نے صرف ہمدردی سے کام لیا ہے۔ اسی لیے ان کی اس سوانح نگاری کو ''مدلل مداحی'' کہا جاتا ہے۔

اپنی معلومات کی جانچ کیجیے۔

4. مجالس النساء کب لکھی گئی؟

5. حالی کی تخلیق کردہ سرسید کی سوانح کا کیا نام ہے؟

6. حالی نے فارسی کے کس شاعر کی سوانح لکھی؟

7. مقدمہ شعروشاعری کس طرح کی تخلیق ہے؟

6.5 حالی کی غزل گوئی

حالی غزل گو شاعر تھے ان کی غزل جن اثرات کے تحت نشوونما پائی اس کی نشاندہی خود انہوں نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کردی ہے۔

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے
غالب کا معتقد ہے، مقلد ہے میر کا

حالی 1854ء میں پہلی بار دہلی آئے۔ اس وقت وہ سترہ سال کے تھے۔ اس زمانے میں دہلی میں ذوق، غالب، مومن زندہ تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی شاعری کا بھی شہرہ تھا دہلی میں شعروادب کی محفلیں زندہ تھیں۔ لال قلعہ میں بھی مشاعرے ہوتے تھے ان ہی مشاعروں میں حالی نے غالب کو سنا تھا انہیں غالب کا کلام بہت پسند آیا۔ غالب کا کلام حالی کے لیے ملاقات کا ذریعہ بنا۔ حالی اردو و فارسی شعروں کا مطلب سمجھنے کے لیے غالب کے پاس جانے لگے۔ اس طرح انہوں نے اردو میں شعر گوئی کی ابتدا کی۔ خستہ تخلص اختیار کیا اور غالب سے اصلاح لینے لگے۔ غالب نے حالی میں پوشیدہ جوہر کو پہچان لیا اور ان کی بڑی ہمت افزائی کی جس سے حالی کی ہمت بڑھ گئی اور وہ فکر شعر کرتے رہے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا کیوں کہ 1855ء سے 1862ء تک حالی دہلی سے دور پانی پت اور حصار میں رہے 1862ء میں وہ دوبارہ پانی پت چھوڑ کر دہلی آئے۔ 1863ء میں ان کی ملاقات جہانگیر آباد کے عالم و فاضل رئیس نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ہوئی جو ایک بلند پایہ شاعر اور مومن کے شاگرد تھے۔ انہوں نے اپنے لڑکے نواب محمد اسحاق خان کی اتالیقی کے لیے حالی کو مقرر کیا۔ حالی سات سال تک جہانگیر آباد میں مقیم رہے۔ اس طرح حالی کا شیفتہ کے ساتھ رہنا بڑا مفید ثابت ہوا۔ ان کے میل جول سے حالی کے شعروسخن کو جلا ملی۔ حالی نے شیفتہ کو اپنا استاد بنالیا۔ اس طرح حالی کی ادبی تربیت غالب اور شیفتہ کی صحبتوں میں ہوئی۔

1869ء میں غالب اور شیفتہ کی وفات کے بعد ملازمت کے سلسلہ میں حالی لاہور آئے اور پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو لاہور میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی اردو کتابوں پر نظر ثانی کریں اور زبان و بیان کی غلطیوں کو درست کریں۔ اس طرح اس ملازمت کی وجہ سے حالی کو مغربی

ادب کی بہت سی کتابوں اوران کے مطالب سے واقفیت ہوئی۔ بہت سے ایسے خیالات جوان کے دل میں موجود تھے ان کے مطالعے سے ان کو جلا ملی۔ انگریزی ادب کے مطالعے سے ان میں تنقیدی شعور پیدا ہوا۔ انہیں معلوم ہوا کہ فارسی ادب کے ذریعہ اردو کی خدمت نہیں ہوسکتی۔ اس لیے مغربی ادب کی طرف ان کا رجحان بڑھتا گیا۔ حالی قدیم اردو شاعری سے مطمئن نہیں تھے۔ لیکن حالی قدیم اردو شاعری میں تبدیلی چاہتے تھے چنانچہ 1874ء میں کرنل ہالرائیڈ ناظم تعلیمات نے محمد حسین آزاد کے تعاون سے لاہور میں نئے انداز کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں غزلوں کے بجائے موضوعی نظمیں پڑھی جانے لگیں حالی نے ان مشاعروں میں سرگرم حصہ لیا اور انہیں کامیاب بنایا۔ 1875ء کے شروع میں حالی دہلی واپس آگئے یہیں سرسید سے ان کی ملاقات ہوئی سرسید کی شخصیت اوران کی بے لوث خدمت سے حالی بڑے متاثر ہوئے وہ ان کے مشن کے ایک جز بن گئے۔ سرسید کے دل میں قوم کا درد تھا وہ مسلمانوں کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانا چاہتے تھے۔ حالی بھی بہت دردمند دل ساتھ لے کر آئے تھے مسدس حالی، مقدمہ شعر وشاعری اور جدید غزلوں کے اصل محرک سرسید ہی تھے جن کی صحبت اور نظریات نے حالی کے ذہن کے تمام دریچے کھول دیے تھے اوران کی فکر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔

1893ء میں ''مقدمہ شعر وشاعری'' طبع ہوا۔ اس میں حالی نے شاعری کی ماہیت اوراس کے عیوب و نقائص پر مفصل بحث کی ہے۔ وہ اردو شاعری اور خصوصاً اردو غزل کی اصلاح چاہتے تھے انہوں نے اردو غزل گوئی کی ہی نہیں اردو شاعری کی عام روش پر اعتراض کیا ہے وہ اردو شاعری میں انقلاب لانا چاہتے تھے اور غزل کو صحیح معنوں میں جدید بنانا چاہتے تھے۔ حالی اردو غزل کی فرسودگی اور تقلیدی انداز سے نالاں تھے۔ حالی نے یہ بات بڑی شدت سے محسوس کی تھی کہ اگر غزل کو زندہ رکھنا ہے تو اس کو بدلنا اور جدید بنانا ہوگا چنانچہ انہوں نے اصلاح کی تجاویز پیش کیں۔ حالی نے ''مقدمہ شعر وشاعری'' میں جدید غزل کے جو اصول پیش کیے ہیں انہیں عملی طور پر برت کے دکھادیا۔ 1857ء تحریک آزادی کے بعد تہذیبی قدریں ٹوٹتی اور بکھرتی جارہی تھیں نئے تصورات نے پرانے افکار و خیالات کے تار و پود بکھیر دیے تھے حالی کو اس کا احساس ہو چکا تھا کہ اپنے شعری وجود کو برقرار رکھنے کے لیے نئے حالات سے مطابقت اور ہم آہنگی پیدا کرنی ضروری ہے۔ قدیم تصورات سے دوری اور جدید خیالات سے قرب ضروری تھا اس لیے حالی نے یہی رویہ اختیار کیا۔ حالی کو اس کا احساس تھا کہ قدیم رنگ شاعری ترک کرنے کے بعد انہوں نے جو نیا آہنگ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے اور جن موضوعات پر وہ زور دے رہے ہیں وہ وقت کا تقاضہ ہیں خواہ انہیں دل، دماغ، معاشرہ اور سماج قبول کرے یا نہیں۔

اب سنو حالؔی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل
ہو چکے حالؔی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

جدید غزلوں میں حالؔی نے نئے نئے خیالات، عصری رجحانات زندگی اور زمانے کے مسائل کو بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

کھیتوں کو دے لو پانی اب بہہ رہی ہے گنگا — کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
بڑھاؤ نہ آپس میں الفت زیادہ — مبادا کہ ہوجائے نفرت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا — سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
قوم کو حالؔی نہیں راس اتفاق — پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

حالؔی کے کلام میں متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ غزل میں سادگی کے قائل تھے۔ سادگی اور سلاست کے باوجود حالؔی کی زبان اونچے طبقے کی مستند زبان ہے۔ انہوں نے طریق اظہار کے انوکھے تجربے نہیں کیے وہ خود رقمطراز ہیں کہ:

"نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرز بیان میں قدما کے طرز بیان سے بہت دور نہ جا پڑے۔ اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو انہیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں۔"

حالؔی جدید شاعری کے بانی ہیں۔ انہوں نے واقعیت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی۔ انہوں نے غزل کو اس قابل بنا دیا کہ وہ ہر قسم کے احساسات، خیالات اور جذبات ادا کر سکے۔ انہوں نے اس کو وسعت، رفعت اور جامعیت عطا کی۔

اپنی معلومات کی جانچ:

8. حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے — غالب کا معتقد ہے، مقلد ہے میر کا

یہ شعر کس کا ہے؟

9. مصرع اولیٰ لکھیے۔ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

6.6 حالؔی کی نظم نگاری

حالؔی کی نظم نگاری ان کے طرزِ فکر کی ترجمان اور اردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ یوں تو حالی کی نظم نگاری کی ابتداء 1874ء میں لاہور سے ہو چکی تھی، جب حالی ملازمت کے سلسلے میں لاہور میں مقیم تھے۔ اس وقت مولانا محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کی ایماء پر شاعری کو بامقصد اور افادی بنانے کے لیے مغرب کے زیر اثر جدید شاعری کی تحریک شروع کی اور انجمن پنجاب کی بنیاد ڈالی تھی۔ انجمن پنجاب کے مشاعروں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مصرعہ طرح کے بجائے نظموں کے عنوانات دیے جاتے تھے۔ اس وقت کے مشہور شاعران مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اس انجمن کے مشاعروں کے لیے حالی نے بھی چار نظمیں برکھارت، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم وانصاف لکھی۔

"برکھارت" میں برسات کی مختلف کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ "نشاط امید" کا موضوع بھی عام ہے۔ اس میں حالی نے امید کی ولولہ خیزی اور دلنوازی پر روشنی ڈالی ہے۔ 1857ء کے ہنگامے کے بعد مسلمان اپنے حال اور مستقبل دونوں سے ناامید ہو چکے تھے اور ماضی کی یادوں کو سینے سے لگائے زندگی گذار دینا چاہتے تھے۔ حالی نے اپنی نظم "نشاط امید" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے کہ امید انسان کو غم کے اندھیرے سے باہر نکالتی ہے اور اسے قوتِ عمل عطا کرتی ہے۔

حالی حبِ وطن کے جذبے سے سرشار تھے وہ وطن کی محبت کو جزوِ ایمان تصور کرتے تھے۔ قومی جذبہ سے بھرپور ان کی یادگار نظم "حب وطن" ہے۔ اس نظم کی ابتداء حالی نے اس نفسیاتی نکتہ سے کی ہے کہ مناظر فطرت اگرچہ بہت دل کش وحسین ہوتے ہیں لیکن اس غریب الوطن کے لیے ان میں وہ دل کشی نہیں رہتی جو وطن میں محسوس ہوتی ہے۔ وطن سے دوری کی کیفیت کو انہوں نے بہت تفصیل سے بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ بعض تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تاریخ کی انقلابی تبدیلیاں بھی اس جذبہ کو لوگوں کے دلوں سے نہ نکال سکیں۔ آریا جب ہندوستان میں آئے تو یہاں کے رہنے والوں نے اپنے آپ کو شدر اور راکشس کہلانا گوارا کیا لیکن وطن کو نہیں چھوڑا۔ رام چندر جی جب بن باس گئے تو ایک لمحہ کے لیے ایودھیا کی یاد ان کے دل سے نہیں گئی۔ آں حضرت صلعم جب بطحا سے یثرب کی طرف چلے گئے تو وہاں کی یاد ان کو برابر آتی رہی۔ اسی طرح حالی نے حضرت یوسف کا قصہ

بیان کیا ہے۔ اوران مختلف مثالوں سے وطن کی محبت کی اہمیت بتائی ہے۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد حالی نے اس جذبہ کو قومی زاویہ نظر سے دیکھا ہے اور نفرت وعداوت جو وطن میں موجود ہے اس کو ختم کر کے محبت کا پیام دیا ہے۔ وہ قوم کے افراد کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو! اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
مرد ہوتو کسی کے کام آؤ ورنہ کھاؤ پیو "چلے جاؤ
جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
ہو مسلمان اس میں یا ہندو بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
جعفری ہو وے یا کہ ہو حنفی جین مت ہو وے یا ہو ویشنوی
سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد شہر ہیں اتفاق سے آباد
قوم پر کرتے ہو اگر احساں تو دکھاؤ کچھ اپنا جوش یہاں
کچھ دنوں عیش میں خلل ڈالو پیٹ میں جو ہے سب اگل ڈالو
علم کو کردو کو بہ کو ارزاں ہند کو کردکھاؤ انگلستاں

اس نظم میں حالی قوم کو عمل کے لیے اکساتے ہیں اور تعمیری کاموں کی طرف راغب کرتے ہیں تا کہ وطن میں خوشحالی آسکے۔

قوم کی عزت اب ہنر سے ہے علم سے یا کہ سیم وزر سے ہے
کوئی دن وہ بھی دور آئے گا بے ہنر بھیک تک نہ پائے گا
نہ رہیں گے سدا سے یہ دن رات یاد رکھنا ہماری آج کی بات
گر نہیں سنتے قول حالی کا پھر نہ کہنا کہ کوئی کہتا تھا

اس طرح حالی کا حب وطن کا تصور اجتماعی اور قومی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ان نظموں کے علاوہ حالی نے "مناظرۂ رحم وانصاف" "مناظرۂ تعصب وانصاف (1882ء) "مناظرۂ واعظ وشاعر" (1882ء) "پھوٹ اور ایکے کا مناظرہ" (1887ء) اور "دولت اور وقت کا مناظرہ" (1887ء) جیسی نظمیں بھی لکھیں جن کا مقصد اخلاقی اور تہذیبی پہلوؤں کو اجاگر کرنا تھا۔ وہ اخلاقی اقدار کی اہمیت تسلیم کروانا چاہتے تھے اور سماج کی برائیوں کی اصلاح ان کا

مطمح نظر تھا۔ ''شکوہ ہند'' میں حالی نے اپنی قوم کے حال کا اس کے ماضی سے موازنہ کر کے موجودہ بدحالی، انتشار اور تنزل کی طرف اشارے کیے ہیں۔ یہ اصلاحی نظمیں تہذیبی اور تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

''مناجات بیوہ'' میں حالی نے ایک بڑے اور اہم سماجی مسئلہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مسئلہ بیوہ کا مسئلہ ہے۔ ہندوستان اور خاص طور پر مسلمانوں کی زندگی میں یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔ کیوں کہ یہاں عورت کی زندگی اس کے شوہر سے عبارت ہوتی ہے اور اگر اس کا شوہر مر جائے تو اسے منحوس سمجھا جاتا ہے۔ اس سے اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا۔ اس کی تمام خوشیاں اس سے چھین لی جاتی ہیں۔ حالی نے ہندوستانی سماج کے اس مسئلے کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے انتہائی سوز و گداز میں ڈوبی یہ نظم لکھی۔

اس نظم میں بیوہ خدا سے فریاد کرتی ہے۔ اور اپنی ذہنی کیفیت اپنی الجھنیں اور پریشانیاں اور اپنی بے بسی کو بیان کرتے ہوئے خدا سے مدد چاہتی ہے کہ اس میں زندگی گزارنے کی ہمت پیدا ہو۔

بے کس کا غم خوار ہے تو ہی　　بری بنی کا یار ہے تو ہی
دکھیا دکھی، یتیم اور بیوہ　　تیرے ہی ہاتھ ان سب کا ہے کھیوا
تو ہی مرض دے تو ہی دوا دے　　تو ہی دوا دارو میں شفا دے
تو ہی پلائے زہر کے پیالے　　تو ہی پھر امرت زہر میں ڈالے
تو ہی دلوں میں آگ لگائے　　تو ہی دلوں کی آگ بجھائے
چمکارے چمکار کے مارے　　مارے مار کے پھر چمکارے
پیار کا تیرے پوچھنا کیا ہے　　مار میں بھی اک تیری مزا ہے

بیوہ اپنے متعلق جو بھی کہتی ہے وہ خدا سے کہتی ہے۔ کیوں کہ اس کا عقیدہ ہے کہ وہی سب کچھ کرنے والا ہے۔ وہ اس مخاطبت میں اپنی زندگی کے سارے مدوجزر کو پیش کر دیتی ہے۔ حالی نے جن خیالات پر ''مناجات بیوہ'' کی بنیاد رکھی وہ گہرے سماجی شعور کا نتیجہ ہیں۔ حالی کو ہندوستانی سماج کی پیچیدگیوں کا پوری طرح اندازہ تھا۔ وہ ان میں اصلاحی تبدیلیاں لانا چاہتے تھے۔

''چپ کی داد'' میں حالی نے عورت کو ماں، بہن اور بیٹی کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ انہوں نے عورت کو قوم کی عزت قرار دیا اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ عورت ماں، بہن اور بیٹی ہوتی ہے۔ زندگی اس کے بغیر نامکمل ہے۔

اے ماؤ! بہنو! بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تمہیں قوموں کی عزت تم سے ہے
تم گھر کی ہو شہزادیاں، شہروں کی ہو آبادیاں
غم گیں دلوں کی شادیاں، دکھ سکھ میں راحت تم سے ہے
نیکی کی تم تصویر ہو، عفت کی تم تدبیر ہو
ہودین کی تم پاسباں، ایماں سلامت تم سے ہے
فطرت تمہاری ہے حیا، طینت میں ہے مہر وفا
گھٹی میں ہے صبر و رضا، انساں عبارت تم سے ہے

ہندوستانی عورت کا وجود خدمت سے عبارت ہے۔ وہ بچپن میں ماں باپ اور بہن بھائیوں کی خدمت کرتی ہے۔ جوانی میں شوہر اور سسرال والوں کی عزت کرتی ہے۔ شادی کے بعد بچوں کی پرورش اس کا سب سے بڑا فرض ہے۔

میکے میں سارے گھر کی تھیں گو مالک و مختار تم
پر سارے کنبے کی رہیں بچپن سے خدمت گار تم
ماں باپ کے حکموں پہ پتلی کی طرح پھرتی رہیں
غم خوار باپوں کی رہیں ماؤں کی تابعدار تم
سسرال میں پہنچیں تو واں اک دوسرا دیکھا جہاں
جا اتریں گویا دیس سے پردیس میں اک بار تم
واں فکر تھی ہر دم یہی ناخوش نہ ہو تم سے کوئی
اپنے سے رنجش کے کبھی پاؤ نہ واں آثار تم

انسانی زندگی کے بعض شعبے ہیں جن کی تکمیل صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ مثلاً بچوں کی پرورش و تربیت کرنا۔ یہ صرف عورت ہی کا حق ہے اور قدرت نے اس کو اسی کام کے لیے بنایا ہے۔ بڑے بڑے بادشاہ، مصلح، واعظ، فلسفی، شاعر، ادیب سب کے سب ماں کی آغوش میں ہی پرورش پاتے ہیں۔

تھا پالنا اولاد کا مردوں کے بوتے سے سوا
آخر یہ اے دکھیا ریو! خدمت تمہارے سر پڑی

پیدا اگر ہوتیں نہ تم بیڑا نہ ہوتا پار یہ
چیخ اٹھتے دو دن میں، اگر مردوں پہ پڑتا بار یہ
سرکار سے مالک کی جتنے پاک بندے ہیں بڑھے
وہ ماؤں کی گودوں کے زینے سے ہیں سب اوپر چڑھے

عورت کی سب سے بڑی حق تلفی اسے علم کی دولت سے محروم رکھنا ہے۔

جب تک جیو تم علم و دانش سے رہو محروم یاں
آئی ہو جیسی بے خبرویسی ہی جاؤ بے خبر
جو علم مردوں کے لیے سمجھا گیا آب حیات
ٹھہرا تمہارے حق میں وہ زہریلا سربسر

لیکن حالی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اب یہ صورت حال زیادہ عرصہ تک باقی رہنے والی نہیں ہے۔ کیوں کہ حالات بدل رہے ہیں۔ اور بدلتے ہوئے حالات میں یہ آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

آتا ہے وقت انصاف کا نزدیک ہے یوم الحساب
دنیا کو دینا ہوگا ان حق تلفیوں کا واں جواب

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ سرسید کی ایماء پر حالی نے ''مسدسِ'' حالی کے نام سے ایک طویل نظم لکھی تھی اس مسدس نے اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا کر دیا اس کا مقصد سوئی ہوئی قوم کو بیدار کرنا اور ان کی قوتِ عمل کو مہمیز کرنا تھا۔ مسدس کے دیباچے میں حالی نے اس کے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس مسدس کے آغاز میں پانچ سات بند تمہید کے لکھ کر اول عرب کی اس ابتر حالت کا خاکہ کھینچا ہے جو ظہور اسلام سے پہلے تھی۔ اور جس کا نام اسلام کی زبان میں جاہلیت رکھا گیا۔ پھر کوکب اسلام کا طلوع ہوا اور نبی امی کی تعلیم سے اس ریگستان کا سرسبز و شاداب ہو جانا اور اس ابر رحمت کا امت کی کھیتی کو رحلت کے وقت ہرا بھرا چھوڑ جانا اور مسلمانوں کا دینی و دنیوی ترقیات میں تمام عالم پر سبقت لے جانا بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ان کے تنزل کا حال لکھا ہے اور قوم کے لیے اپنے بے ہنر ہاتھوں سے ایک آئینہ خانہ بنایا ہے جس میں آکر وہ اپنے خدوخال دیکھ سکتے ہیں کہ ہم کون تھے اور کیا ہو گئے۔''

حالی نے مسدس کو بقراط کے اس قول سے شروع کیا ہے کہ زندگی میں مرض کو مرض اور بیماری کو بیماری نہ سمجھنا ہی سب سے مہلک مرض اور سب سے بری بیماری ہے۔ اس نظریہ کا اطلاق مسلمانوں پر کیا ہے جس میں اپنی ذلت کا احساس بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ تمام باتیں اس قوم میں موجود تھیں جو ایک زوال آمادہ قوم میں ہوتی ہے۔ اس قوم نے اپنے اعمال سے اپنے دین تک کو بدنام کیا۔ وہ دین جس نے انہیں آداب انسانیت اور تمدن سکھایا۔ محبت کا سبق پڑھایا۔ تعصب سے ڈرایا۔ زندگی کے زریں اصولوں سے آگاہ کیا۔ مسلمانوں نے ان ہی اسلامی اصولوں کو خیر باد کہہ دیا۔ جس کی وجہ سے نہ دولت باقی رہی نہ عزت۔ علم وفن بھی رخصت ہو گئے۔ شرافت کا خاتمہ ہو گیا۔ محنت ومشقت کی عادت ختم ہو گئی۔ حالی نے اس صورت حال پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

ادا کر چکی جب حق اپنا حکومت — رہی اب نہ اسلام کی اس کو حاجت
مگر حیف اے فخر آدم کی امت — ہوئی آدمیت بھی ساتھ اس کے رخصت
حکومت تھی گویا اک بوجھ تم پر — اترتے ہی اس کے نکل آئے جوہر
زمانے میں ہیں ایسی قومیں بہت سی — نہیں جن میں تخصیص فرماں دہی کی
پر آفت کہیں ایسی آئی نہ ہوگی — کہ گھر گھر پہ یاں چھا گئی آ کے پستی
چکور اور شہباز سب اوج پر ہیں — مگر ایک ہم ہیں کے بے بال و پر ہیں
وہ ملت کے گردوں پہ اس کا قدم تھا — ہر اک کھونٹ میں جس کا برپا علم تھا
وہ فرقہ جو آفاق میں محترم تھا — وہ امت لقب جس کا خیرالامم تھا
نشاں اس کا باقی ہے صرف اس قدر یاں — کہ گنتے ہیں اپنے کو ہم بھی مسلماں
وگرنہ ہماری رگوں میں لہو میں — ہمارے ارادوں میں اور جستجو میں
دلوں میں زبانوں میں اور گفتگو میں — طبیعت میں فطرت میں عادت میں خو میں
نہیں کوئی ذرہ نجابت کا باقی — اگر ہو کسی میں تو ہے اتفاقی

حالی نے قوم کو قعر مذلت سے باہر نکلنے کا احساس دلایا ہے اور ایک نئی دنیا کی تصویر کھینچی ہے جس میں شاندار مستقبل ان کا راستہ دیکھ رہا ہے۔

مجھے ڈر ہے اے قوم کے میرے یارو! مبادا کہ وہ ننگ عالم تمہیں ہو
گر اسلام کی کچھ حمیت ہے تم کو تو جلدی سے اٹھو اور اپنی خبر لو
وگرنہ یہ قول آئے گا راست تم پر کہ ہونے سے ان کا نہ ہونا ہے بہتر
حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سراسر کھلی ہیں
صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پرجا تلک سب سکھی ہیں
تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

حالی کی عظمت ان کی غزلیات کے علاوہ ان کے مسدس کی وجہ سے ہے۔اس سے ان کے فطری جوہر کا اظہار ہوتا ہے۔اظہار کی سادگی اور توازن' الفاظ کی سلاست' روحانی جذبات کی گرمی اور خلوص مسدس میں بے ساختگی سے جمع ہو گئے ہیں۔

غرض کہ حالی نے نہ صرف نیچرل شاعری کی بنیاد رکھی بلکہ قومی' معاشرتی' سماجی ناانصافی' عورت کے حقوق کی پامالی اور قوم کی تعلیمی پسماندگی کے موضوعات پر بھی نظمیں لکھیں۔وہ اپنے وقت کے بہت بڑے نباض تھے۔ان کے شعور میں بیداری تھی۔وہ حالات کو دیکھ کر ماحول کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ان کے پاس زندگی کا بہت واضح نقطہ نظر تھا۔اس لیے ان کے پاس زندگی کو بنانے، حالات کو سدھارنے اور ماحول کو نکھارنے کی ایک خواہش بھی تھی۔وہ اپنے دور کی صحیح نمائندگی کرتے ہیں۔ان کی یہ نظمیں جدید شاعری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اپنی معلومات کی جانچ:

10. حالی نے نظم نگاری کی ابتدا کب اور کہاں سے کی تھی؟
11. وطن کی محبت کے موضوع پر حالی کی کون سی نظم ہے؟
12. مناجات بیوہ میں حالی نے کس موضوع کو بیان کیا ہے؟

6.7 خلاصہ

خواجہ الطاف حسین حالی ایک ادیب' نقاد' سوانح نگار اور نظم نگار ہیں۔نیچرل شاعری کے بانیوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔وہ سرسید کے رفقا میں شامل تھے۔محمد حسین آزاد کے ساتھ موضوعاتی مشاعروں کی بنیاد ڈالی۔اور ان مشاعروں کے لیے برکھارت' نشاط امید' مناظرۂ رحم وانصاف اور حب وطن جیسی نظمیں لکھیں۔سرسید کی ایما پر ''مسدس حالی'' لکھ کر قوم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔حیات سعدی' یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی یادگار سوانح عمریاں لکھ

کرار دو زبان میں سوانح نگاری کی بنیاد ڈالی۔ تنقید پر ان کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالی نے شاعری کی تقریباً تمام اصناف غزل، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، مرثیہ اور نظم میں طبع آزمائی کی۔ حالی جدید شاعری کے بانی ہیں۔ انہوں نے واقعیت اور حقیقت نگاری کو اہمیت دی۔ ان کی نظمیں ان کے طرزِ فکر کی ترجمان اور اردو شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

1904ء میں حالی کو علمی و ادبی خدمات کے سلسلہ میں شمس العلما کا خطاب ملا۔ 1914ء میں وفات ہوئی۔ پانی پت میں مشہور صوفی درویش حضرت بوعلی شاہ قلندر کی درگاہ کے احاطہ میں سپرد خاک ہوئے۔

6.8 نمونہ امتحانی سوالات

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات 10-10 سطروں میں لکھیے۔

1. حالی کے حالات زندگی بیان کیجیے۔
2. حالی کی نظم نگاری پر تبصرہ کیجیے۔
3. حالی کی تحریر کردہ سوانح عمریوں پر ایک نوٹ لکھیے۔

مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات 30-30 سطروں میں لکھیے۔

4. حالی کی غزل گوئی اور نظم نگاری کی خصوصیات کیا ہیں؟
5. مناجات بیوہ اور چپ کی داد پر ایک نوٹ لکھیے۔
6. مسدس حالی کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے حالی کی شاعرانہ خصوصیات قلم بند کیجیے۔

6.9 فرہنگ

تحصیل علم	علم حاصل کرنا
شہرہ	دنیا بھر میں مشہور
خستہ	مفلس، بدحال، زخمی، مرمرہ
اتالیق	استاذ، تربیت دینے والا
انشاپرداز	ادیب، مضمون نگار

عفت　　عصمت، پارسائی

طینت　　طبیعت، عادت

گردوں　　آسمان

6.10 سفارش کردہ کتب

حالی بحیثیت شاعر　　شجاعت علی سندیلوی

سرسید اوران کے نامور رفقا　　سید عبداللہ۔ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

مقدمہ شعروشاعری　　مرتبہ وحید قریشی

تحقیق مطالعہ حالی　　ظہیر احمد صدیقی

6.11 اپنی معلومات کی جانچ: نمونہ جوابات

1. حالی کے والد کے انتقال کے وقت حالی کی عمر نو سال تھی۔
2. حالی دہلی کے مدرسہ حسین بخش میں شریک ہوئے۔
3. حالی کی نظم مسدس مدوجزر اسلام 1879ء میں منظر عام پر آئی۔
4. مجالس النساء 1874ء میں لکھی گئی۔
5. سرسید کی سوانح کا نام حیات جاوید ہے۔
6. حالی نے فارسی شاعر شیخ سعدی شیرازی کی سوانح حیات ''حیات سعدی'' کے نام سے لکھی۔
7. مقدمہ شعروشاعری اردو تنقید کی اولین کتاب ہے۔
8. یہ شعر حالی کا ہے۔
9. فرشتہ سے بہتر ہے انسان بننا
10. حالی نے نظم نگاری کی ابتدا لاہور سے کی تھی۔
11. حب وطن
12. مناجات بیوہ میں حالی نے بیوہ عورتوں کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

اِکائی 10 : نظیر اکبرآبادی: ہنس نامہ

ساخت

7.1	اغراض ومقاصد
7.2	تمہید
7.3	نظیر اکبرآبادی کے حالاتِ زندگی
7.4	نظیر اکبرآبادی کی ادبی خدمات
7.5	نظیر اکبرآبادی کی نظم گوئی
7.6	نظم ''ہنس نامہ'' کا متن (اقتباس)
7.7	نظم ''ہنس نامہ'' کا تجزیہ
7.8	خلاصہ
7.9	نمونہ امتحانی سوالات
7.10	فرہنگ
7.11	معاون کتابیں
7.12	اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

7.1 اغراض ومقاصد

اِس اِکائی کا مقصد نظیر اکبرآبادی کی حیات اور اُن کی نظم گوئی کی اہم خصوصیات سے روشناس کرانا ہے۔ اِس سلسلے میں اُن کی زندگی کے اہم گوشوں پر رَوشنی ڈالی گئی ہے تا کہ آپ اُن کی شخصیت اور اَدبی خدمات سے متعارف ہوسکیں۔ اِس اِکائی میں نظیر اکبرآبادی کی شُہرہ آفاق نظم ''ہنس نامہ'' کے اصل متن کو شامل کیا گیا ہے۔ نظم کی اہم خصوصیات سے بحث بھی کی گئی ہے اور تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تجزیہ اور خصوصیات کی رَوشنی میں اِس نظم کے اندازِ بیان سے بھی واقفیت ہوگی اور اُن کی اِس نظم کی تفہیم کے علاوہ دیگر نظموں کو سمجھنے میں بھی آسانی ہوگی۔

7.2 تمہید

اردو کے شعری و نثری سرمایہ نے بول چال کی زبان میں ترقی کی ۔ جب رفتہ رفتہ اُردو ادب کو ایک مقام حاصل ہو گیا تو اُس کے تجزیہ اور ناپ تول کے پیمانے بدل گئے اور کچھ مخصوص اَدبی مراکز میں محدود کر دئے جانے کے سبب اُس کا رشتہ عوام سے منقطع ہو گیا۔ اَدب میں سادگی اور عوامی زبان کے بجائے عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کی کثرت نظر آنے لگی۔ اُن خیالات کو موضوعِ سخن بنایا جانے لگا جن کا تعلق براہِ راست ہندوستانی عوام کی زندگی سے نہ تھا۔ شعرائے کرام نظم کے بجائے زیادہ تر قصیدہ اور غزل کی اصناف میں اپنے فن کے جوہر دکھانے کو کمال سمجھنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ نظم کا انمول ذخیرہ ایک مدت تک علمائے ادب کی اُس توجہ سے محروم رہا جس کا وہ مستحق تھا۔ دراصل اُنھیں نظم کے روشن امکانات کا نہ تو اندازہ تھا اور نہ ہی وہ اُس کی افادیت و اہمیت سے واقف تھے۔ اگر چہ دکنی شعراء کی مثنویات کے کچھ حصے نظم کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ دکن میں محمد قلی قطب شاہ اور دہلی میں فائز اور حاتم نے بھی ابتدائی دور میں متعدد نظمیں لکھی ہیں مگر نظم جدید کا بانی نظیر اکبر آبادی ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد کرنل ہالرائڈ کی سرپرستی میں مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے جدید نظم کی بنیاد رکھی۔ اُنھوں نے شاعری میں سادگی، صفائی، برجستگی، حقیقت بیانی اور مناظرِ قدرت کی تصویر کشی پر زور دیا۔ جس کے سبب شعرائے اُردو نیچرل شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ اگر چہ شمالی ہند میں نظیر اکبر آبادی نے بہت پہلے اس قسم کی نظموں کی شروعات کر کے شاعری کو عام آدمی سے قریب تر کر دیا تھا۔

7.3 نظیر اکبر آبادی کے حالاتِ زندگی

نظیر اکبر آبادی کا نام شیخ ولی محمد اور اُن کے والد کا نام شیخ محمد فاروق ہے۔ اُن کی تاریخ پیدائش کا اب تک صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے۔ اب تک کی تحقیقات کی روشنی میں اُن کی ولادت 1735ء یا 1740ء کے درمیان تسلیم کی جا سکتی ہے۔ فالج کے شدید حملے کے سبب اُن کی وفات 1830ء میں ہوئی۔

جب احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اپنے خاندان کے ساتھ اکبر آباد یعنی آگرہ میں آ کر محلہ تاج گنج میں مقیم ہو گئے۔ آگرہ ہی کو اپنا وطن سمجھ کر اپنے تخلص کے ساتھ اکبر آبادی یعنی نظیر اکبر آبادی لکھنے لگے اور اسی قلمی نام سے دُنیائے ادب میں مشہور ہوئے۔

نظیر اکبر آبادی کا تعلق خاندانِ قریش سے تھا۔ وہ اپنے والدین کی تیرہویں اولاد تھے۔ اُن کے بارہ بھائی

بہن اُن سے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔ تیرہویں اور آخری اولاد ہونے کے سبب اُن کی پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ نظرِ بد سے بچانے کے لئے بچپن ہی میں اُن کے کان میں دُروالی بالیاں اور ناک میں بُلاق پہنا کر اُن کی وضع لڑکیوں کی سی بنادی گئی۔

اپنے عہد کے رواج کے مطابق نظیر نے اُردو کے ساتھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اُنہیں پہلوانی اور فنِ سپہ گری میں بھی کمال حاصل تھا۔ وہ اکھاڑوں میں پہلوانوں سے کُشتیاں بھی لڑا کرتے تھے۔ اُنہیں بچپن ہی سے ورزش کا شوق تھا جسے اُنہوں نے آخری وقت تک ترک نہیں کیا۔ دیوانِ نظیر اکبرآبادی کے مقدمہ میں فرحت اللہ بیگ نے نظیر اکبرآبادی کا حُلیہ حسبِ ذیل تحریر کیا ہے:

> ''رنگ گندم گوں، قد میانہ، پیشانی اونچی اور چوڑی، آنکھیں چمک دار اور بینی بلند تھی۔ داڑھی خشخاشی اور مونچھیں بڑی رکھتے تھے۔.....لباس وہی تھا جو محمد شاہ کے زمانہ میں دہلی میں رائج تھا یعنی کھڑکی دار پگڑی، گاڑھے کا انگرکھا سیدھا پردہ نیچی چولی، اُس کے نیچے کُرتہ، ایک برکا پاجامہ، گھیتلی جوتی۔ ہاتھ میں شام دار چھڑی، اُنگلیوں میں فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں۔''

نظیر اکبرآبادی کی شادی دہلی کے محمد رحمان خاں کی دختر تہورالنساء بیگم کے ساتھ ہوئی تھی۔ جس کے بطن سے دو اولادیں گلزار علی اور امامی بیگم پیدا ہوئیں۔ نظیر مشرباً شیعہ تھے۔ بڑی عقیدت و احترام سے تعزیہ داری بھی کرتے تھے۔ پچاس روز تک مسلسل مجلسِ عزا کا اہتمام کرتے مگر اُن کے کلام میں کہیں تعصب اور تنگ نظری کی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ وہ تمام مذاہب کے بُزرگوں کا احترام بھی کرتے تھے اور اُن سے عقیدت بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب کا ماننے والا اُن کی قدر کرتا تھا۔ اُن کی وفات پر شیعہ اور سُنّی دونوں فرقے کے لوگوں نے اپنے اپنے طریقہ پر نمازِ جنازہ ادا کی۔ جنازے کی چادر اُن کے ہندو شاگردوں نے بطورِ تبرّک لے لی۔ مسلمانوں نے اُن کے سوئم کے روز قرآن خوانی کرائی تو ہندوؤں نے اُن کی قبر پر شاندار میلے کا اہتمام کیا۔

نظیر اکبرآبادی ایک صوفی مُنش شاعر تھے۔ اُن کی طبیعت میں بلا کا فقر و استغنا تھا۔ اُنہوں نے کسی راجا یا نواب کے دربار سے وابستہ ہونے کے بجائے معلّمی کی تنخواہ پر ہی گزر بسر کرنے کو بہتر سمجھا۔ اُن کی شاعری سے متاثر ہو کر اَودھ کے نواب اور بھرت پور کے راجا نے اُنہیں اپنے یہاں مدعو کیا مگر اُنہوں نے وہاں جانے سے انکار کر دیا اور تمام عمر آگرہ ہی میں رہے۔ وہ کچھ دِنوں تک متھرا میں قلعدار مرہٹہ ''بھاؤ'' کے معلّم رہے۔ اِس کے بعد نواب محمد علی خاں کے بچّوں کو پڑھاتے رہے۔ آخر میں سات روپے ماہوار کی اُجرت پر راجا بلاس رائے کھتری کے بچّوں کو

تعلیم دینے لگے اور ایک وقت کا کھانا بھی اُنہیں کے یہاں کھانے لگے۔

نظیر اکبرآبادی کے شاگردوں میں میر قطب الدّین باطن (مولف تذکرۂ گلستانِ بے خزاں المعروف بہ نغمہء عندلیب)، گلزار علی اسیر (پسرِ نظیر اکبرآبادی)، مہاراجا بلونت سنگھ راجا، شیخ حُسین بخش بخشی، راجا لالہ بدھ سین صافی، شیخ مداری ضمیر، حکیم میر محمدی ظاہر، نبی بخش عاشق، بیدار بخش لہر، مُنشی حسین علی خاں لہجہ کے نام نہایت اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

1. نظیر اکبرآبادی کی پیدائش کس شہر میں ہوئی تھی؟
2. نظیر اکبرآبادی کا پورا نام کیا ہے؟
3. نظیر اکبرآبادی کس پیشے سے وابستہ تھے؟
4. نظیر اکبرآبادی کی وفات کس سَن میں ہوئی؟

7.4 نظیر اکبرآبادی کی ادبی خدمات

نظیر اکبرآبادی اردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جن کی شاعری صحیح معنوں میں زندگی اور اُس کے مسائل کی ترجمان ہے۔ اُن کی تمام عمر عوامی زندگی کے مشاہدوں اور تجربوں میں گزری۔ اُن کی نگاہوں نے جو دیکھا اور اُن کے دِل و ذہن نے جو محسوس کیا اُسے اُنہوں نے بے ساختگی، بے تکلّفی اور اِنتہائی فطری انداز میں اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا۔ اُن کی شاعری میں برَج بھوٗمی کی سوندھی مٹّی کی سوندھی بو اور عوام کے دِل کی دھڑکنوں کو صاف طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک زود گو شاعر تھے وارفتہ مزاجی کے سبب اُن کے کلام کا ایک بڑا حصّہ ضائع ہو گیا یا دوسروں کی مِلکیت بَن گیا۔ اُنہوں نے کبھی اپنے کلام کو محفوظ یا مُرتّب کرنے کی طرف توجّہ نہ کی اُن سے جو شخص فرمائش کرتا، اُس کی منشا کے مطابق اُسے نظم لکھ کر عنایت کر دیتے اور پھر اُس کلام سے بے نیاز ہو جاتے۔ فرمائش پر کلام لکھوانے والوں میں گداگر بھی ہوتے اور قلندر بھی، پھیری والے بھی ہوتے اور خوانچے والے بھی، چَنا جور گرم والے بھی ہوتے اور حلوائی بھی ہوتے، کُنجڑے بھی ہوتے اور دیگر پیشہ وران بھی۔

راجا بلاس رائے کے بیٹوں (ہر بخش رائے، گُرو بخش رائے، مؤل چند رائے، نَین سُکھ رائے، بنسی دھر اور شنکر داس) کی کوششوں سے اُن کے کلام کا پہلا کُلّیات شائع ہوا تھا۔ جس میں تقریباً سات ہزار اشعار تھے۔ اِس کلّیات کے علاوہ اُن کے دو دیوان انجمن ترقّیِ اردو نے 1942ء میں شائع کیے تھے۔ جن کی ترتیب و تصحیح مرزا فرحت

اللہ بیگ نے کی تھی۔ اُن کے ایک فارسی دیوان کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جس کے نمونے پروفیسر عبدالغفور شہباز کے مرتب کردہ کلیاتِ نظیر میں پائے جاتے ہیں مگر اب تک اِس دیوان کا سُراغ نہیں مِل سکا۔

نثر میں بھی نظیر اکبرآبادی نے کئی کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں سے نو کتابیں فارسی زبان میں ہیں اور ایک کتاب اُردو زبان میں ہے جس کا نام ''فہم ترین'' ہے۔ اِس کتاب میں آسان اور عام فہم زبان میں مبتدی طلباء کے لئے رُقعات تحریر کیے گئے ہیں تا کہ وہ خط و کتابت کے اصول سے آگاہ ہوسکیں۔ اُنہوں نے خالق باری کی طرز پر ایک منظوم کتاب لُغت بھی لکھی تھی۔

نظیر اکبرآبادی سے قبل اُردو کے بیشتر شعراء عام موضوعات پر لکھنے اور عوامی مسائل کی ترجمانی اور تصویر کشی سے گُریز کرتے تھے۔ نظیر اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی شاعری کا تانا بانا خالص ہندوستانی عناصر اور عوامی زندگی کے مسائل سے تیار کیا ہے۔ زندگی کا ایسا کوئی رنگ، روپ اور گوشہ نہیں جس پر اُن کی نظر نہ پڑی ہو۔ نظیر نے نظم، غزل، مثنوی، قصیدہ، مسدّس، مخمّس، ترجیع بند، مستزاد، رباعی غرض مختلف اصنافِ سخن میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کا اصل کارنامہ اُن کی نظمیں ہی ہیں۔ جن کی بنیاد پر اُنہیں عوامی شاعر اور اُن کی شاعری کو عوامیت و جمہوریت کا ترجمان کہا جاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

5. نظیر اکبرآبادی کے کلام کا پہلا کُلیات کس کی کوششوں سے شائع ہوا؟
6. نظیر اکبرآبادی نے منظوم کتاب لُغت کس کتاب کی طرز پر لکھی تھی؟
7. نظیر اکبرآبادی کو کس صنفِ سخن کی بُنیاد پر عوامی شاعر کہا جاتا ہے؟

7.5 نظیر اکبرآبادی کی نظم گوئی

نظیر اکبرآبادی سے قبل اور اُن کے بعد بھی اُردو کے بیشتر شعراء غزل تک ہی محدود تھے۔ البتہ کچھ شعراء کبھی کبھی مثنویاں بھی کہہ لیتے تھے۔ شاہی درباروں سے وابستہ شعراء شاہوں، نوابوں اور امراء کی شان اور مدح میں قصائد کہہ کر اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ ادب کا تعلق عوام سے برائے نام تھا۔ ادب کو دبستانوں تک محدود کر دیا گیا تھا۔ بے لطف مضامین اور فرسودہ خیالات کی نہ صرف بھرمار تھی بلکہ اُنہیں کو بار بار دُہرایا جانے لگا تھا۔ نظیر اکبرآبادی نے دہلی اور لکھنؤ کے اَدبی مراکز سے دور رہ کر اور وہاں کے شعراء کے رنگِ سخن سے بے نیاز ہو کر اپنی شاعری

کی اَلگ راہ ہموار کی۔ اُن کی منفرد طبیعت اور آزاد منشی نے اُنہیں کسی دبستان یا نظریے کا پابند نہ ہونے دِیا۔ اُنہوں نے غزل سے زیادہ نظم کی طرف توجہ دی۔ اُن کی نظموں میں جو حقیقت وصداقت، انسان دوستی و وطن پرستی، وسعتِ قلب وہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ اُن سے پہلے کسی شاعر کے یہاں نظر نہیں آتی۔ اُن کی شاعری میں ارضیت اور انسان دوستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ دراصل وہ اُردو کے پہلے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے عوام کے خیالات وجذبات کی عکاسی اور نیچرل شاعری کی بُنیاد رکھی۔ نظیر نے اپنے گرد وپیش کے ماحول ومعاشرت اور حالات وواقعات کو بہت قریب سے دیکھا، بَرتا اور بھوگا، اُن کے دِل پر جو بیتی اور اُنہوں نے جو محسوس کیا اُسے سچّائی، ایمان داری اور سادگی کے ساتھ نظموں کے پیکر میں ڈھال دِیا۔ اُنہوں نے بَندھے ٹکے استعاروں اور کنایوں کو تَرک کر کے صاف گوئی سے کام لیا۔ اگر چہ نظیر کے یہاں کوئی عمیق فلسفہ یا فَن کی گہرائی نہیں مگر اُن کی نظموں کے موضوعات متنوع ہیں۔ کلامِ نظیر کے تنوع سے متعلق نیاز فتح پوری رقم طراز ہیں:

> ''نظیر کا کُلّیات ایک ایسا نایاب ذخیرہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو، معیشت ومعاشرت کا کوئی انداز اور احساسات وتاثرات کا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جو اُس میں موجود نہ ہو۔ امیر وغریب، شاہ و گدا، زاہد ورِند، ہندو ومسلمان، گبر وترسا..... علاحدہ علاحدہ سب کی دِل چسپی کا سامان اس میں موجود ہے اور عالمِ محسوسات کی شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس کا ذکر کسی نہ کسی نہج سے نظیر نے نہ کیا ہو۔ مشاغلِ زندگی، ضروریاتِ انسانی، مظاہرِ تمدّن میں مقطّع اور ہَنسوڑ قسم کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسے نظیر نے چھوڑ دیا ہو اور جس پر پورے اہتمامِ شاعرانہ کے ساتھ قلم نہ اُٹھایا ہو۔''

نظیر اپنی نظموں میں حقائق کا ذکر اِس انداز سے کرتے ہیں کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ اُنہوں نے اپنی نظموں میں میلوں ٹھیلوں، تماشوں، عُرسوں، تیوہاروں وغیرہ کی ایسی عکاسی کی ہے کہ اُس عہد کی معاشرت اور سماجی حالات کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ آدمی نامہ، فنا نامہ، کلجُگ، روٹی نامہ، کوڑی نامہ اور مفلسی کا شمار اُن کی بہترین نظموں میں کیا جاتا ہے۔ بنجارہ نامہ، خواب کا طلسم اور ہَنس نامہ علامتی نظمیں ہیں۔ بَنجارہ نامہ جس قدر ظاہری اعتبار سے دِل چسپ ہے اُس سے کہیں زیادہ معنوی اعتبار سے بھی بُلند پایہ ہے۔ اُنہوں نے بَنجارہ نامہ میں اِنسان کو بَنجارہ اور اُس کے سفرِ حیات یعنی زِندگی کو بنجارے کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کی دوسری نظموں کی طرح اِس نظم میں بھی زندگی کی ناپائیداری اور دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر تفصیل سے ہے مگر اندازِ بیان اِس قدر دل چسپ اور پُر لُطف ہے کہ قاری یا سامع کے ذہن میں فنا کا دِل دوز تصوّر بھی نہیں آتا۔ وہ تلخ حقائق کے باوجود یاسیات کا شکار نہیں ہوتا بلکہ

صالح عمل کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ بنجارے کی خانہ بدوشی اور زندگی کی ناپائیداری کی مرقع کشی کے لئے نظیر نے جن موزوں اور مناسب الفاظ کا استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اِس نظم کے مصرع ''سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ'' نے ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اِس مصرع کے علاوہ نظیر کی دوسری نظموں کے متعدد مصرعے اور اشعار آج تک ضرب المثل کے طور پر استعمال کئے جا رہے ہیں مثلاً:

..... کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ، یاں دِن کو دے اور رات لے
کیا خوب سَودا نقد ہے، اِس ہاتھ دے اُس ہات لے

..... گوڑی کے سب جہان میں نقش و نگین ہیں
گوڑی نہیں تو گوڑی کے پھر تین تین ہیں

..... دُنیا میں بادشاہ ہے، سو ہے وہ بھی آدمی

..... پورے ہیں وہی مَرد جو ہر حال میں خوش ہیں

..... اللہ آبرو سے رکھے اور تندرست

..... عاشق ہے تو دِل بر کو ہر اِک رنگ میں پہچان

..... جو خاک سے بنا ہے وہ آخر کو خاک ہے

..... آخر کے تئیں ہَنس اکیلا ہی سِدھارا

نظیر اکبر آبادی کے نزدیک دُنیا دار المکافات ہے۔ جہاں نیکی کا بدلہ نیک اور بَدی کا بَد ہے۔ نظم ''فقیروں کی صدا'' اور ''کلجگ'' میں بھی ''بنجارہ نامہ'' جیسی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اِس قسم کی نظموں میں خواہ فقیروں کی صدائیں ہوں یا صوفی سَنتوں کے اِرشادات یا سَبق آموز نصائح سب سے یہی درس مِلتا ہے کہ اِنسان کو مایوس یا نا اُمید ہونے کے بجائے جینے کے سلیقے کے ساتھ سفرِ آخرت کی تیاری میں لگ جانا چاہئے۔ نظم ''کلجگ'' کا اندازِ بیان واعظانہ اور ناصحانہ ہے۔ ''فقیروں کی صدا'' کے مخصوص آہنگ، قلندرانہ لہجے اور الفاظ کے اِنتخاب و ترتیب نے مضمون کی اثر آفرینی کو دوبالا کر دِیا ہے۔ اِس نظم کے پہلے بَند میں وہ کہتے ہیں۔

بَٹ مارا اَجل کا آپہونچا، ٹک اِس کو دیکھ ڈرو بابا اَب اَشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سَرد بھرو بابا
دِل ہاتھ اُٹھا اِس جینے سے، لے بَس مَن مار مرو بابا جب باپ کی خاطر روتے تھے اَب اپنی خاطر رو بابا
تَن سوکھا کُبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اَب مَوت نقارہ باج چُکا، کچھ چلنے کی فکر کرو بابا

نظیرؔ مذہباً مُسلمان اور مشرباً شیعہ تھے لیکن تعصّب اور تنگ نظری اُنہیں چھوٗ بھی نہیں گئی تھی۔ وہ دیگر مذاہب کے پیشواؤں اور بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔ اُن کے کلّیات میں مذہبی نظمیں بھی کثیر تعداد میں ہیں۔ اُنہوں نے حمدِ الٰہی اور نعتِ سرورِ کونین کے ساتھ مہادیو، دُرگا دیوی، ہَر اور بھیروں کی تعریف بھی کی ہے۔ حضرت علی، حضرتِ عبّاس، پنجتن پاک اور اولیائے کرام کی مناقب، معجزات اور کرامات کے علاوہ گرونانک جی کی بھی دِل کھول کر مدح کی ہے۔ اُنہوں نے بلدیو جی کے میلے، مہادیو کے بیاہ اور کنہیّا جی کی شادی کی منظرکشی کے علاوہ کرشن جی کی لیلاؤں کے ایسے جیتے جاگتے مُرقعے پیش کیے ہیں کہ تمام مناظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ شری کرشن کو مارنے کے لئے کنس نے جن راکھشوں یعنی شیاطین کو بھیجا تھا اُنہیں کرشن جی نے کس طرح موت کے گھاٹ اُتارا، اِس منظر کو نظیرؔ نے اپنی نظم ''دَسم کتھا'' کے ایک بند میں اِس طرح بیان کی ہے۔

لے گوال بال جانے لگے شیام مَن ہَرن گوئیں لگے چرانے جہاں ہے یہ گوردَھن

واں بھی بتاسُر آیا، بکاسُر بھی بگلا بن مارا اور اُس کی چونچ کو چیرا سمیت تن

آیا لگھاسُر اُس کے بھی سَر کو اُڑا دیا

وہ اپنی نظم ''ہَر کی تعریف'' میں سِری کرشن کے مختلف القاب و اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مَیں کیا کیا وصف کہوں یارو اُس شیام برن اوتاری کے سیکشن، کنہیّا، مُرلی دھر، مَن موہن، کُنج بہاری کے

گوپال، منوہر، سانولیا، گھن شام، اٹل، بنواری کے نندلال، دُلارے، سُندر چھب برج چند، مُکٹ جھلکاری کے

کر دھوم لٹیّا دودھ ماکھن، رَنچھوڑ، نول گِردھاری کے بن کُنج پھریا، راس رچن، سُکھ دائی، کانھ مُراری کے

ہر آن دِکھیّا روپ نئے، ہَر لیلا نیاری نیاری کے پت لاج رکھیّا، دُکھ بھنجن، ہَر بھگتی بھگت اَدھاری کے

نِت ہَر بھج ہَر بھج رے بابا، جو ہَر سے دھیان لگاتے ہیں

جو ہَر کی آسا رکھتے ہیں، ہَر اُن کی آس بجاتے ہیں

گرونانک جی کی بارگاہ میں سَر جھکا کر عرض داشت بھی قابلِ توجہ ہے۔

اِس بخشش کے اِس عظمت کے ہیں بابا نانک شاہ گرو

سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دَم بولو واہ گرو

نظیرؔ اکبرآبادی نے جہاں عید اور شب برات پر نظمیں کہی ہیں وہیں ہولی، دیوالی راکھی اور بسنت پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اُنہوں نے ہولی کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جب پھاگُن رنگ جھمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی　　اور دَف کے شور کھڑکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی　　خُم شیشے جام چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

نظیر اکبرآبادی نے آج سے پہلے اُن عام موضوعات پر کثیر تعداد میں نظمیں کہیں ہیں جن موضوعات کی طرف عہدِ حاضر کے شعراء بھی پوری طرح متوجہ نہیں ہو سکے ہیں۔ روپیہ، پیسہ، گوڑی، تِل کے لڈو، آندھی، تربوز، آگرے کی ککڑی، کورا برتن، اندھیری رات، اوس، بُڑھاپے کی تعلّیاں، آٹے دال کا بھاؤ، چپاتی وغیرہ اُن کی ایسی نظمیں ہیں جن کا تعلّق براہِ راست عوام اور عوامی مشاغل و مسائل سے ہے، اگر نظیر عام انسانوں کے درمیان نہ رہتے، اُن کے دُکھ درد میں شریک نہ ہوتے، اُن کے جذبات و احساسات کو محسوس نہ کرتے تو وہ عوام کے شاعر بھی نہ ہوتے۔ اُنہیں اُن کی ایسی نظموں ہی کی وجہ سے عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ نظیر کی بیشتر نظمیں صبر و قناعت کا دَرس دیتی ہیں مگر وہ زندگی کی بُنیادی ضرورت کو خالص مادّی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ خالی پیٹ زندگی کے بوجھ کو بہت دِنوں تک نہیں اُٹھا سکتا۔ شاہ ہوں یا گدا، صوفی ہوں یا مرتاض سب کی بُنیادی ضروت روٹی ہے۔ پیٹ میں روٹیاں نہ ہوں تو معرفتِ نفس اور معرفتِ حق کی طرف بھی طبیعت کا رجوع ہونا محال ہوتا ہے۔ نظم روٹیاں میں اِس حقیقت کو نظیر اِس طرح واضح کرتے ہیں۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے　　یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سُن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے　　ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

میتھو آرنلڈ نے شاعری کو تنقیدِ حیات کہا ہے۔ اِس نقطۂ نظر سے نظیر اکبرآبادی کی شاعری زندگی اور اُس کے نشیب و فراز سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اُنہوں نے عوامی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا نہایت باریک بینی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ وہ جس چیز کا ذکر کرتے ہیں اُس سے متعلّق تمام جُزئیات کا بیان اِس طرح کرتے چلے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارے مناظر اور ساری اشیاء وہی ہیں جن سے ہم سب بخوبی واقف ہیں اور آئے دِن ان سے دوچار بھی ہوتے رہتے ہیں مگر ہم ان سب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دیتے۔

خواب کا طلسم، چاندنی، دید بازی، اشتیاقِ دید، بہار، سراپا، طلسم وصال، شبِ عیش جیسی نظموں کا رنگ عاشقانہ ہے۔ اگر ان کی اس قسم کی نظموں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے لطافت و رنگینی کے

پیرائے میں دُنیا کی بے ثباتی کو مصوّرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ نظم ''خواب کا طلسم'' عیش وعشرت کے مزے لوٹنے کے بعد وہ کہتے ہیں۔

ایدھر تو جوشِ عشق، اُدھر حُسن اور جنوں　　ناز وادا کی آ کے لگی ہونے دَھپ دَھپوں
اِن عشرتوں میں آہ نصیبوں کو کیا کہوں　　چاہا مَیں اُس پری سے جو کچھ اور کچھ کہوں
اِتنے میں ہائے یار مری آنکھ کھل پڑی

نظیر اکبرآبادی نے ظرافت ومزاح کے پیرائے میں بھی زندگی کی حقیقتوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی کئی نظمیں ظرافت ومزاح کی بہترین نمونہ ہیں۔ اُن کے یہاں اگر چہ فن کی گہرائی اور گیرائی نہیں پھر بھی وہ معاشرتی حالات وواقعات اِس انداز سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ وہ کبھی کبھی واقعیت پسندی کی رَو میں متانت وسنجیدہ ظرافت کی حد سے باہر بھی نکل جاتے ہیں مگر اُن کا مقصد پھکڑ پن نہیں۔ اُن کی اِس قسم کی نظموں میں چوہوں کا اچار، حُسنِ طلب، طِفلی، لطفِ شباب وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ نظم ''طفلی'' کے ایک بَند میں وہ کہتے ہیں۔

دِل میں کسی کے ہرگز نے شرم، نے حیا ہے　　آگا بھی کھُل رہا ہے، پیچھا بھی کھُل رہا ہے
پہنے پھرے تو کیا ہے، ننگے پھرے تو کیا ہے　　یاں یوں بھی واہ وا ہے، اور واں بھی واہ وا ہے
کچھ کھالے اِس طرح سے، کچھ اُس طرح سے کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

نظیر اکبرآبادی کو زبان وبیان پر قدرت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اپنے خیالات اور نظموں کے موضوعات کے مطابق زبان اور لہجہ کو اپنایا۔ چوں کہ اُن کی شاعری کا بیشتر حصہ عوامی زندگی، عوامی مشاغل ومسائل، مقامی تیج تیوہاروں اور تقریبات سے متعلق ہے۔ اِس لئے اُنہوں نے اُسی زبان کو اپنی نظموں میں استعمال کیا جو عوام میں رائج تھی۔ اُن کے یہاں موضوع کے اعتبار سے مقامی بولیوں کے الفاظ کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ نظیر نے شعوری طور پر عربی، فارسی اور سنسکرت کے دقیق اور مشکل الفاظ سے گریز کیا ہے۔ چوں کہ اُن کا تعلّق سماج کے ہر طبقہ سے تھا اور اُنہوں نے ہر طبقہ کے افراد کے لئے شاعری کی ہے۔ جس میں اعلیٰ طبقہ کے افراد بھی ہیں اور ادنیٰ بھی، شُرفاء بھی ہیں اور اوباش بھی، خاندانی بھی ہیں اور بازاری بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے یہاں کہیں کہیں ابتذال اور سوقیانہ پن بھی پایا جاتا ہے۔ نظیر کو مروجہ زبان، روزمرّہ، محاوروں اور ضرب الامثال کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ اُن کی

کوئی نظم ایسی نہیں ہے جس میں محاوروں کا استعمال نہ ہوا ہو۔ نظیر کے فن اور زبان و بیان کی سب سے پہلے تعریف کرنے والا ایک غیر مُلکی محقق فیلنؔ ہے جس نے اپنی ہندوستانی انگریزی ڈکشنری کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے:

''صرف یہی ایک شاعر (نظیر اکبرآبادی) ہے جس کی شاعری اہلِ فرنگ کے نصاب کے مطابق سچّی شاعری ہے مگر ہندوستان کی لفظ پرستی اُس کو سرے سے شاعر ہی تسلیم نہیں کرتی۔ صرف نظیر ہی ایسا شاعر ہے جس کے اشعار نے عام لوگوں کے دِل میں راہ کی ہے، اُس کے اشعار ہر سڑک اور گلی میں پڑھے اور گائے جاتے ہیں، خصوصاً اُس کے خاص شہر آگرہ میں...... اُس کی نظمیں آپ اُس کی سوانح عمری ہیں کیوں کہ قالبِ نظم میں یہ شخص اپنی تمام ذاتی خصوصیتوں کے ساتھ جیتا جاگتا نظر آتا ہے......اُس کی طبیعت کی رنگا رنگی اُس کی تخیئل کی قوت علاوہ بَریں اِس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اُس نے ایک ہی چیز کی مختلف نظموں میں مختلف پہلو سے مختلف تصویریں دکھائی ہیں۔ اُس کا دیوان خاصا تصویروں کا ایوان ہے، جس میں ہندوستان کے رہنے والوں کے کھیل تماشے، عیش، تفریح، رَنج، غم، دِل و دماغ سب کی بولتی چالتی تصویریں نظر آسکتی ہیں۔''

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے:

8. نظیر اکبرآبادی سے قبل اُردو کے بیشتر شعراء، کن اصناف تک محدود تھے؟
9. نظیر اکبرآبادی کو، کس صنف کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی؟
10. نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں، کس موضوع کو مَرکزیت حاصل ہے؟
11. نظیر اکبرآبادی کی پانچ نظموں کے نام لکھئے۔

7.6 نظم ''ہنس نامہ'' کا متن (اقتباس)

دُنیا کی جو اُلفت کا ہُوا مُجھ کو سہارا　　　اور اُس نے خوشی کو مری خاطر میں اُتارا
دیکھی جو یہ غفلت تو مرا دِل یہ پُکارا　　　آیا تھا کسی شہر سے اِک ہنس بچارا
اِک پیڑ پہ جنگل کے ہُوا اُس کا گزارا
چنڈول، اگن، ابلقے، جھپّاں، بئے ڈھیر　　　میناوبئے، کِلکلے، بَگلے بھی سمنبر

رہتے تھے، بہت جانور اُس پیڑ کے اوپر   طوطے بھی کئی طور کے، ٹوئیاں، کوئی لہبر
اُس نے بھی کسی شاخ پہ گھر اپنا سنوارا

بُلبُل نے کیا اُس کی محبت میں خوش آہنگ   اور کوکلے کوئل نے بھی اُلفت کو لیا سنگ
کھنجن میں کلنگوں میں بھی چاہت کے بجے چنگ   دیکھا جو طیوروں نے اُسے حُسن میں خوش رنگ
وہ ہنس لگا سب کی نگاہوں میں پیارا

سیمرغ بھی سَو دِل سے ہوئے ملنے کے شائق   گدھ پنکھ بھی پنکھوں کے ہوئے جھلنے کے لائق
سارَس بھی حواصل بھی ہوئے اُس کے موافق   باز و لگڑ و جُرہ و شاہیں ہوئے عاشق
شِکروں نے بھی شکر سے کیا اُس کا مدارا

کچھ سبزک و بڑ مکے و کچھ ٹنٹن و بئے   پنڈخی سے لگا ٹوٹر و قمری و ہریوے
غوغائی، گمیری و لٹورے و پپیہے   کچھ لال چڑے، پودنے پھدّے ہی نہ غش تھے
پدڑی بھی سمجھتی تھی اُسے آنکھ کا تارا

چاہت کے گرفتار بٹیریں، لوے، تیتر   کبکوں کے تدروں کے بھی چاہت میں بندھے پر
ہُد ہُد بھی ہوئے ہمت کے بڑھیّا اِدھر اُدھر   زاغ و زغن و طوطی و طاؤس، کبوتر
سب کرنے لگے اُس کی محبت کا اِشارا

شکل اُس کی وہیں جی میں کُھبی شام چڑی کے   دی چاہ جتا پھر اُسے جھانپوں نے بھی جھپ سے
ہَر یَل بھی ہوئے اُس کی ہَری چاہنے والے   چھٹے غرض اُس پیڑ پہ رہتے تھے پرندے
اُس ہنس پہ اُن سب نے دِل و جان کو وارا

خواہش یہ ہوئی سب کی کہ ہر دَم اُسے دیکھیں   اور اُس کی محبت سے ذرا مُنہ کو نہ پھیریں
دِن رات اُسے خوش رکھیں، بہت سُکھ اُسے دیویں   صحبت جو ہوئی ہنس کی اُن جانوروں میں
یک چند رہا خوب محبت کا گزارا

سب ہو کے خوش اُس کی مئے اُلفت لگے پینے   اور پیت سے ہر ایک نے واں بھر لئے سینے
ہر آن جتانے لگے چاہت کے قرینے   اُس ہنس کو جب ہو گئے دو چار مہینے
اِک روز وہ یاروں کی طرف دیکھ پکارا

یاں لطف و کرم تم نے کیے ہم پہ ہیں جو جو　　تم سب کی یہ خوبی کہاں ہم سے بیاں ہو
تقصیر کوئی ہم سے ہوئی ہووے تو بخشو　　لو یار واب ہم جاویں گے کل اپنے وطن کو
اَب تم کو مبارک رہے یہ پیڑ تمہارا

اب تک تو بہت ہم رہے فرحت سے ہم آغوش　　اَب یادِ وطن دِل کی ہمارے ہوئی ہمدوش
جب حرفِ جُدائی کا پرندوں نے کیا گوش　　اِس بات کے سُنتے ہی جو ہر اِک کے اُڑے ہوش
سب بولے یہ فرقت تو نہیں ہم کو گوارا

بن دیکھے تمہارے ہمیں کب چین پڑیں گے　　اِک آن نہ دیکھیں گے تو دِل غم سے بھریں گے
گر تم نے یہ ٹھیرائی تو کیا سُکھ سے رہیں گے　　ہم چتنے ہیں سب ساتھ تمہارے ہی چلیں گے
یہ درد تو اب ہم سے نہ جاوے گا سہارا

پھر ہنس نے یہ بات کہی اُن سے کئی بار　　کچھ بس نہیں اَب چلنے کی ساعت سے ہیں ناچار
آنکھیں ہوئیں اشکوں سے پرندوں کی گُہر بار　　اِس میں جو شب کوچ کی ہوئی صبح نمودار
پر اپنا ہُوا پر وہیں اُس ہنس نے مارا

وہ ہنس جب اُس پیڑ سے واں کو چلا ناگاہ　　مُنھ پھیر کے اِدھر سے وطن کی جو ہیں لی راہ
دیکھا جو اُسے جاتے ہوئے واں سے تو کر آہ　　سب ساتھ چلے اُس کے وہ ہمراز ہُوا خواہ
ہر ایک نے اُڑنے کے لئے پنکھ پسارا

اور ہنس کی واں سب کو رفاقت ہوئی غالب　　جب واں سے چلا وہ تو ہوئی بے بسی غالب
کُلفت تھی جو فرقت کی وہ سب پر ہوئی غالب　　دو کوس اُڑے تھے جو ہوئی ماندگی غالب
پھر پر میں کسی کے نہ رہا قوت و یارا

پر اُن کے ہوے تر جو ہیں، دوری کی پڑی اوس　　روئے کہ رفاقت کی کریں کیوں کہ قدم بوس
تھک تھک کے لگے گرنے تو کرنے لگے افسوس　　کوئی تین، کوئی چار، کوئی پانچ اُڑا کوس
کوئی آٹھ، کوئی نو، کوئی دس کوس میں ہارا

کچھ بن نہ سکے اُن سے رفیقی کہ جو واں کار　　اور اتنے اُڑے ساتھ کہ کچھ ہووے نہ اظہار
جب دیکھی وہ مشکل تو پھر آخر کہ تئیں ہار　　کوئی یاں رہا، کوئی واں رہا، کوئی ہو گیا ناچار

کوئی اور اُڑا آگے جو تھا سب میں گرارا

تھی اُس کی محبت میں جو ہر ایک نے پی مے سمجھے تھے بہت دِل میں وہ اُلفت کو بڑی شے

جب ہو گئے بے بس تو پھر آخر یہ ہوئی رے چیلیں رہیں، کوّے گرے اور باز بھی تھک کے

اس پہلی ہی منزل میں کیا سب نے کنارا

دُنیا کی جو اُلفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیوں کہ ہو نر باہ

ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجے کیا چاہ سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ

آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سِدھارا

7.7 نظم ''ہنس نامہ'' کا تجزیہ

''ہنس نامہ'' نظیر اکبرآبادی کی ایک مشہور علامتی نظم ہے جسے ہم حکیمانہ تمثیل یا ایلیگری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اِس نظم میں اُنہوں نے حکایتی اور مصوّرانہ انداز میں اِنسان کی عارضی زندگی اور کارخانہء قدرت کے رواں دواں رہنے کا ذکر کیا ہے۔ ہنس کی حکایت بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ایک ہنس کسی شہر سے اُڑتا ہُوا آیا اور اُس نے جنگل کے ایک دَرخت کی شاخ پر اپنا گھر بنا لیا۔ اُس دَرخت کی شاخوں پر پہلے ہی سے مختلف قسم کے بہت سے پرندے رہتے تھے۔ جن میں سے کچھ کے نام چنڈول، مینا، بیا، ہنگلا، طوطا، ٹوئیاں، بُلبُل، کھنجن، گوپنکھ، شِکرا، باز، شاہین، قمری، پپیہا، پودنا، پدڑی، بٹیر، لٹکیک، ہُد ہُد، طاؤس، کبوتر، زاغ، زغن، شام چوی ہیں۔ اِس درخت پر رہنے والے کچھ پرندے اُسے دیکھتے ہی اُس سے پیار کرنے لگے۔ کچھ چند روز میں اُس ہنس سے گھل مِل گئے۔ رفتہ رفتہ ہنس اُن سب سے اور وہ سب ہنس کی اُنسیت و محبت میں گرفتار ہو گئے۔ گہرے مراسم اور تعلقات کے سبب اَب وہ یہ تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے کہ اُنہیں ایک روز ہنس کی مفارقت بھی برداشت کرنا پڑے گی مگر قانونِ قدرت سے کسی کو نجات حاصل نہیں۔ کچھ عرصہ تک سب کے دِن ہنسی خوشی سے گزرتے رہے اور پھر وہ دِن بھی آ گیا جب اُس درخت کو خیرآباد کہہ کر ہنس کو اپنے وطن جانے کے لئے مجبور ہونا پڑا۔ پہلے تو پرندوں کو یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ ہنس اُن سے جُدا ہو رہا ہے لیکن جب اُنہیں یقین ہو گیا کہ ہنس کی مفارقت کے بغیر کوئی چارہ نہیں تو اُن میں سے ہر ایک پرندہ اُس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ اپنی اپنی بساط، طاقت، ہمت اور حوصلہ کے مطابق سب اُس کے ساتھ اُڑ چلے۔ کچھ تو تھوڑی دور تک ہی اُڑ کر تھک گئے اور اُنہوں نے اپنے پر سمیٹ لئے۔ کچھ طیور جو بہت طاقتور تھے یا جنہیں ہنس سے

بہت زیادہ اُلفت ومحبت تھی، اُنہوں نے کافی دور تک اُس کا ساتھ دینے کی کوشش کی۔ دورانِ سفر ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں وہ بھی حالات سے مجبور ہو گئے۔ بالآخر ہنس تنہا رہ گیا اور وہ اپنے وطن کو اکیلا ہی سِدھارا۔

نظیر نے اپنی اِس نظم کے ذریعہ اِنسانی زندگی کی بے ثباتی اور دُنیا کے لگاؤ کو حکیمانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اِنسان اِس دُنیا میں تنہا اور خالی ہاتھ آتا ہے اور ایک دِن تنہا خالی ہاتھ واپس بھی جاتا ہے۔ صِرف اُس کے نیک وبد اعمال ہی اُس کے ساتھ رہ جاتے ہیں۔ اُس کا حُسنِ سلوک اور اُس کی یادیں ہی باقی رہ جاتی ہیں۔ جب وہ دُنیا میں آتا ہے تو اُس کے متعلقین خوشیاں مناتے ہیں۔ اُس سے چاہت کا اظہار کرتے ہیں اور بعض اُس کے لئے اپنی جان بھی نثار کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ مختلف لوگوں سے تعلقات بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اُس کے عزیز و اقارب، یار و دوست اور دوسرے متعلقین اپنے اپنے طور پر اُس سے اظہارِ محبت کرتے ہیں لیکن جب وہ اِس دارِ فانی سے رخصت ہوتا ہے تو اُس کے تمام ہمدرد و رفیق اور ساتھی ایک ایک کر کے چھوٹ جاتے ہیں۔ وہ تمام کوششوں کے باوجود نہ اُسے روک سکتے ہیں اور نہ ہی اُس کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

اِس نظم میں نظیر نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ اِنسان کو دُنیاداری اور عارضی چیزوں میں اِس قدر مبتلا نہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنی حقیقت وحیثیت ہی کو بھول جائے۔ اُسے چاہئے کہ زندگی کو حُسنِ سلوک اور سلیقہ سے گزارے اور آخرت کے لئے نیک وصالح اعمال کا توشہ بھی جمع کرتا رہے۔ اِس نظم میں نظیر اکبرآبادی نے ایک ساتھ اِتنے پرندوں کو اِکٹھا کر دِیا ہے کہ اس کی مثال اُردو میں تو کیا دوسری زبان کی شاعری میں بھی مِلنا محال ہے۔

نظیر کی اِس نظم میں پیڑ دُنیا کی اور پرندے اِنسانوں کی علامت ہیں۔ مختلف قِسم یا بھانت بھانت کے طیور مختلف مزاج، ہیئت، طبائع، خیالات اور مختلف قِسم کے اِنسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اِنسانوں کی طرح ہر طائر کی اہلیت وحیثیت ایک دوسرے سے جُداگانہ ہے، بالکل اُسی طرح جیسے تمام عزیز واقارب، رِشتہ داروں اور ہمدردوں کی حیثیت ایک دوسرے سے جُداگانہ ہوتی ہے۔ وہ کسی شخص سے اپنی اوقات، بساط اور تعلقات کے اعتبار سے اُنسیت و محبت کرتے ہیں۔ تمثیل کے پیرائے میں نظیر نے ہر پرند کی حیثیت کے مطابق ہنس سے وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً بُلبُل جس کی آواز شیریں ہوتی ہے وہ خوش الحانی سے ہنس کی تعریف کرتا ہے۔ کھنجن اور کُلنگ جیسے پرندے چنگ بجا کر اُس کا استقبال کرتے ہیں اور اُس کا دِل بہلاتے رہتے ہیں۔ سیمُرغ جیسا پُر احتشام اور عالی حوصلہ طائر ہنس سے ملاقات کرنے کا خواہاں ہے۔ جس سے ہنس کی عظمت وشان کا پتہ چلتا ہے۔ گرُ پنکھ چوں کہ قوی جسم کا مالک ہوتے ہوئے بھی ادنیٰ قِسم کا پرند ہے۔ اِس لئے وہ پنکھا جھل کر ہی ہنس کی خدمت کرنے کو سعادت سمجھتا ہے۔ غرض ہر طائر

اپنی حیثیت کے مطابق اُس ہنس کی خدمت کرتا ہے اور اُس سے اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے۔ نظم کے دسویں بند سے درخت کی فضا میں مایوسیت چھانے لگتی ہے۔ صبح سلامت شام غم میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ہنس کی مفارقت سے ہر پرند کے ذہن و دل پر رقت و یاس طاری ہے۔ سب مجبوری و بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتے ہیں کہ ''موت سے کس کو رستگاری ہے، آج وہ کل ہماری باری ہے۔'' مختصر یہ کہ وہی پُر حسرت سماں اور وہی رقت آمیز کیفیت ہر طائر کی ہے جو کسی قریبی شخص کی وفات کے وقت اُس کے اعزہ و اقارب کی ہوتی ہے۔

اظہارِ محبت کے لئے شکرا کی مناسبت سے شکر، جھانپو کی مناسبت سے جھپ، ہریل کی مناسبت سے ہری اور گڑھ پنکھ کی مناسبت سے پنکھ کا استعمال نظیر کے زبان داں ہونے کا ثبوت ہے۔ نظیر کی دوسری نظموں کی طرح اس نظم میں بھی اُنہوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے محاوروں کا استعمال کیا ہے مثلاً خاطر میں اُتارنا، آنکھ کا تارا، غش ہونا، پَر بندھنا، جی میں کھُبنا، مُنھ کو پھیرنا، ہوش اُڑنا، چین پڑنا، پر مارنا، مُنھ پھیرنا، راہ لینا، اوس پڑنا، کِنارا کرنا وغیرہ۔

اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے

12. نظم ''ہنس نامہ'' میں پیڑ اور جانور یعنی طیور کس کی علامت ہیں؟

13. ''ہنس نامہ'' میں استعمال کئے گئے پانچ پرندوں کے نام لکھئے۔

7.8 خلاصہ

نظیر اکبر آبادی کا نام شیخ ولی محمد اور تخلص نظیر تھا۔ اُن کی تاریخ پیدائش کا اب تک صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُن کی ولادت 1735ء اور 1740ء کے درمیان دہلی میں اور وفات 1830ء میں آگرہ میں ہوئی۔ اُنہیں شاعری کے علاوہ پہلوانی اور سپہ گری کا بھی شوق تھا۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُن کا بہت سا کلام ضائع ہو گیا۔ وارفتہ مزاجی کے سبب اُنہوں نے کبھی اپنے کلام کو جمع کرنے یا مرتب کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔ لوگوں کی فرمائش پر کلام لکھتے اور اُنہیں سپرد کرنے کے بعد اپنے کلام سے بے نیاز ہو جاتے۔ اُن کا پہلا کُلیات راجا بلاس رائے کے لڑکوں کی کوششوں سے منظرِ عام پر آیا۔ اِس کے بعد مرزا فرحت اللہ بیگ نے اُن کے دو دیوان مرتب کئے۔ نظیر زندگی بھر معلّمی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اُن کی شاعری سے متاثر ہو کر اَودھ کے نواب اور بھرت پور کے راجا نے اُنہیں اپنے درباروں میں مدعو کیا لیکن اُنہوں نے آگرہ کو چھوڑنا گوارہ نہ کیا اور زندگی بھر آگرہ ہی میں رہے۔ آزاد منشی اور

طبیعت کی انفرادیت نے اُنہیں شاعری کے کسی دبستان کا پابند نہ ہونے دیا۔ اُنہوں نے اُس دَور کے شعراء کے رنگِ سخن سے بے نیاز ہوکر اپنی شاعری کی الگ راہ نکالی اور غزلوں سے زیادہ نظم کی طرف توجہ دی۔ اُن کی شاعری زندگی اور اُس کے نشیب و فراز سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ اُن کے یہاں ارضیت اور اِنسان دوستی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اُن کی نظمیں حقیقت و صداقت اور وسعتِ قلب و ہم آہنگی کی ترجمان ہیں۔ اُنہوں نے اپنے گرد و پیش کے واقعات و ماحول کو نہایت سچائی اور سادگی کے ساتھ اشعار کے پیکر میں ڈھال دیا۔ نظیر مذہباً مسلمان اور مشرباً شیعہ تھے مگر اُن کے کلام میں کہیں تعصب یا تنگ نظری نظر نہیں آتی۔ اُن کی نظمیں زندگی کے ہر روپ اور ہر رنگ کی ترجمان ہیں۔ اُنہوں نے اخلاقی اور سماجی موضوعات پر متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں کی عکاسی بھی کی ہے اور مختلف مذاہب کے بزرگوں کی دِل کھول کر مدح بھی کی ہے۔ نظیر کو خیالات و موضوعات کے مطابق زبان کے استعمال پر قدرت حاصل ہے۔ اُنہوں نے اپنی شاعری کے لئے اُسی زبان کو اپنایا جو اُس وقت عوام میں رائج تھی۔ اُن کے یہاں روزمرّہ، محاورات اور ضرب الامثال کے علاوہ مقامی بولیوں کے الفاظ بھی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

7.9 نمونہ امتحانی سوالات

الف۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 10-10 سطروں میں دیجیے:

1. نظیر اکبرآبادی کی مختصر سوانح لکھئے۔
2. نظیر اکبرآبادی کی اَدبی خدمات پر ایک نوٹ لکھئے۔

ب۔ درج ذیل سوالوں کے جواب 30-30 سطروں میں تحریر کیجئے:

1. نظم "بنجارہ نامہ" کی خصوصیات تحریر کیجئے۔
2. نظیر اکبرآبادی کی نظم نگاری پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجئے۔
3. مندرجہ ذیل بند کی تشریح کیجئے:

دُنیا کی جو اُلفت ہے تو اُس کی ہے یہ کچھ راہ — جب شکل یہ ہووے تو بھلا کیوں کہ ہو نر باہ
ناچاری ہو جس جا میں تو واں کیجے کیا چاہ — سب رہ گئے جو ساتھ کے ساتھی تھے نظیر آہ
آخر کے تئیں ہنس اکیلا ہی سِدھارا

7.10 فرہنگ

آنکھ کا تارا	بہت پیارا۔نہایت عزیز
اَبلقا	ایک خوش آواز پرندہ، جس کا قد مَینا کے برابر ہوتا ہے
اوس پڑنا	جوش نہ رہنا۔کام بگڑ جانا۔خلل پڑنا
بخشو	معاف کرو۔درگزر کرو
بَڑنگا	ایک قسم کا پرند، جس کی ناک بڑی ہوتی ہے
بُڑہ	ایک قسم کی چڑیا جسے بُرجھا بھی کہتے ہیں
بگیری	گورَیا سے مشابہ ایک قسم کی خاکی رنگ کی چڑیا، جو تالابوں کے آس پاس رہتی ہے
بےبَس ہونا	مجبور ہونا۔ناچار ہونا۔عاجز ہونا
پدّا	ایک قسم کی چھوٹی چڑیا جسے پھُدکی بھی کہتے ہیں
پدڑی	ایک قسم کی چڑیا جو بَیا نامی چڑیا سے چھوٹی اور کئی رنگوں کی ہوتی ہے
پَسارا	پھیلایا۔کھولا
پنڈخی	کبوتر کی قسم کا ایک پرند جو سُرخی مائل بھورے رنگ کا ہوتا ہے
پودنا	ایک پرند کا نام۔اِس کا رنگ بھورا ہوتا ہے لیکن موسم کے مطابق رنگ بدلتا رہتا ہے
پیت	محبت۔چاہت
تقصیر	خطا۔قصور
ٹوٹرو	ایک قسم کا پرند جو فاختہ سے چھوٹا ہوتا ہے۔چھوٹی پنڈخی
جُرہ	ایک شکاری پرند کا نام، جس کا رنگ مَٹ مَیلا ہوتا ہے، یہ اُڑتی ہوئی چڑیوں کو جھپٹ کر پکڑ لیتا ہے
جھانپو	ایک قسم کا پرند جسے مموُلا بھی کہتے ہیں۔یہ پرندہ کئی رنگ اور مختلف قسم کا ہوتا ہے
جھپ سے	فوراً۔بلا توقف
چاہ	محبت۔اُنسیت۔اُلفت
چَنڈول	ایک قسم کی خاکی رنگ کی چڑیا، اِس کی آواز سُریلی ہوتی ہے

چَنگ ایک قسم کا باجا جو ستار سے مشابہ ہوتا ہے

حواصل ایک قسم کا سفید آبی پرند، جس کا پوٹا بڑا اور آگے کی طرف نکلا ہوا ہوتا ہے

خوش رکھنا مسرور رکھنا۔ شاداں رکھنا

راہ لینا رخصت ہونا۔ روانہ ہونا

رَے حالت۔ کیفیت

سَمَرک ایک قسم کا پرند جس کا کنٹھ اور ڈینے نیلے ہوتے ہیں، اسے نیل کنٹھ بھی کہتے ہیں

سِدھارا رخصت ہوا۔ روانہ ہوا

سَمَنبَر سفید۔ اُجلا

سَودِل سے نہایت خوشی سے۔ نہایت شوق سے

سیمُرغ ایک قسم کا پرند جسے عُنقا بھی کہتے ہیں

شامِ چڑی ایک قسم کا پرند جسے شیاما بھی کہتے ہیں، اس کا رنگ کالا اور پیر پیلے ہوتے ہیں

طیور طَیر کی جمع۔ پرندے

غَش مبہوت۔ فِدا

غوغائی ایک قسم کا پرند جسے ڈومنی بھی کہتے ہیں، یہ پرند پپیہا نامی پرند سے مشابہ ہوتا ہے

قمری فاختہ کی قسم کا ایک پرند جس کا رنگ سفید ہوتا ہے اور گردن میں طَوق دار دھاری ہوتی ہے

کچھ بَن نہ سکنا کوئی تدبیر کارگر نہ ہونا۔ مجبور ہونا

کَرارا طاقتور۔ زور آور

کُلفت رَنج۔ غم

کِلکِلا ایک قسم کی چڑیا جو اکثر مچھلی کھاتی ہے

کوس فاصلہ کی ایک حدِ معیّنہ کا نام

کوکلا فاختہ کی قسم کا ایک پرند، جس کی گردن میں طوق کی سی دھاریاں ہوتی ہیں

کھُبی پسند آئی

کھنجن	ایک قسم کا پرند جس کی چونچ لال اور دُم ہلکی کالی جھائیں لئے ہوئے سفید ہوتی ہے
گودھ پنکھ	ایک قسم کا پرند جس کے بال لمبے ہوتے ہیں
گوش کرنا	سُننا۔سماعت کرنا
لٹورا	ایک قسم کا تقریباً دس اِنچ کا لمبا پَرند، جس کی گردن اور مُنھ کالا۔ ڈَینے نیلے اور دُم کالی ہوتی ہے
لگڑ	ایک قسم کا بڑا باز جو عموماً چھوٹے پرندوں کا شِکار کرتا ہے
لَوا	تیتر کی قسم کا ایک پَرند جو تیتر سے بہت چھوٹا ہوتا ہے
لَہبر	ایک قسم کا لمبا طوطا جس کی گردن بھی لمبی ہوتی ہے
مُدارا	خاطر۔تواضع
مُنھ پھیرنا	شریکِ حال نہ رہنا۔ساتھ چھوڑنا۔بے مروّتی کرنا
مُنھ کو نہ پھیرنا	بے وفائی نہ کرنا۔بے رُخی نہ کرنا
ناچاری	عاجزی۔بے چارگی۔بے بسی
نِت	ہمیشہ۔دائم
نِرباہ	نِباہ۔گزارہ
ہارا	تھک گیا۔کمزور ہوگیا۔عاجز ہوگیا
ہُدہُد	ایک پرند کا نام جسے کُٹھ پھوڑا اور مُرغِ سُلیماں بھی کہتے ہیں، اِس کے سر پر تاج نُما چوٹی ہوتی ہے
ہَری	بہبودی۔بھلائی
ہَریَل	کبوتر کی قسم کا ایک پَرند جو کبوتر سے چھوٹا ہوتا ہے اِس کا رنگ سُرخ یا ہلکا کالا ہوتا ہے
ہَریوہ	سبز رنگ کی ایک چڑیا جسے ہَری بُلبُل بھی کہتے ہیں، اِس کی چونچ کالی، پیر زرد اور لمبائی تقریباً پندرہ انگشت ہوتی ہے
ہم آغوش رہنا	باہم مِلنا۔گلے لگنا۔بغل گیر ہونا۔صحبت میں رہنا
یارا	طاقت۔توانائی

7.11 معاون کتابیں

1. زندگانی بے نظیر — سیّد محمد عبدالغفور شہبازؔ
2. روحِ نظیر — سیّد محمد محمود رضوی مخمورا کبرآبادی
3. نظیر نامہ — شمس الحق عثمانی
4. فرہنگِ نظیر — ڈاکٹر شریف احمد قریشی

7.12 اپنے مطالعے کی جانچ : جوابات

1. نظیر اکبرآبادی کی پیدائش دہلی میں ہوئی تھی۔
2. نظیر اکبرآبادی کا پورا نام شیخ وَلی محمد ہے۔
3. نظیر اکبرآبادی معلّمی کے پیشے سے وابستہ تھے۔
4. نظیر اکبرآبادی کی وفات 1830 میں ہوئی۔
5. نظیر اکبرآبادی کے کلام کا پہلا کُلّیات راجا بلاس رائے کے لڑکوں کی کوششوں سے شائع ہوا۔
6. نظیر اکبرآبادی نے منظوم کتاب لُغت ''خالقِ باری'' کی طرز پر لکھی تھی۔
7. نظیر اکبرآبادی کو نظم کی بُنیاد پر عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔
8. نظیر اکبرآبادی سے قبل اُردو کے بیشتر شعراء اصنافِ غزل، قصیدہ اور رباعی تک محدود تھے۔
9. نظیر اکبرآبادی کو صنف نظم کی بدولت شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔
10. نظیر اکبرآبادی کی شاعری میں اَرضیت اور اِنسان دوستی کو مَرکزیت حاصل ہے۔
11. کلجُگ۔ آدمی نامہ۔ مُفلِسی۔ بنجارہ نامہ۔ بَنس نامہ۔
12. نظم ''بَنس نامہ'' میں پیڑ ''دُنیا'' اور جانور یعنی طیور ''اِنسانوں'' کی علامت ہیں۔
13. طوطا۔ بُلبُل۔ فاختہ۔ قمری۔ سیمُرغ۔